رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۳۰

جلد ۵۷، عدد ۶ مارچ ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵- اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

اسلامی ریاست

سید ابو الاعلیٰ مودودی

- اسلام کے نظریۂ سیاسی کی مستند تشریح
- اسلام کے نظامِ ریاست کی مکمل تصویر
- اسلامی دستور اور قانون پر سیر حاصل بحث
- پاکستان میں تدوینِ دستور کی تاریخ کا ایک اہم باب
- علماء و طلبائے قانون و سیاست کے لیے ایک خزینۂ علم
- علمِ سیاست پر ایک عظیم کتاب
- مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے تبحرِ علمی کی آئینہ دار

عمدہ کتابت، مضبوط جلد ۔ قیمت قسم اعلیٰ بارہ روپے ۔ سستا ایڈیشن آٹھ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳۔ای، شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ٦	مارچ سنہ ١٩٦٢ء	جلد ٥٧

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

ضروری اعلان

اشاعت گزشتہ میں آیت خاتم النبیین پر جو مفصل حاشیہ لکھا گیا تھا اس کے متعلق ملک کے مختلف حصّوں سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ اسے ایک مستقل پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا جائے۔ میں نے بھی یہ محسوس کیا کہ عوام الناس کو خالص علمی حیثیت سے ختم نبوّت کے مسئلے کی حقیقت سمجھانے کی شدید ضرورت ہے۔ اس امت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے دعوائے نبوت کا فروغ پانا قطعاً ناممکن تھا اگر عام لوگوں میں اپنے دین سے ناواقفیت پھیلی ہوئی نہ ہوتی۔ آج اگر اس ناواقفیت کو دور کر دیا جائے اور بڑے پیمانے پر لوگوں کو یہ بتا دیا جائے کہ اسلام میں ختم نبوّت کے عقیدے کی کیا اہمیت ہے اور وہ کن دلائل پر مبنی ہے، تو یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی مسلمان جان بوجھ کر وہ راہ اختیار کرے جو اسے دین سے باہر لے جانے والی ہو۔

اسی ضرورت کو محسوس کر کے میں نے اس مضمون کو از سر نو مرتّب کیا ہے۔ اس میں اُن شبہات کو بھی رفع کر دیا ہے جو ختم نبوّت کے عقیدے میں رخنہ ڈالنے کے لئے پیش کئے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ مسیح موعودؑ کی حقیقت پر بھی ایک مفصل بحث کا اضافہ کر دیا ہے تاکہ گمراہی کا یہ راستہ بھی بند ہو جائے۔

میری درخواست پر اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ (۱۱ سی، شاہ عالم مارکیٹ لاہور) اس بات پر راضی ہو گئی ہے کہ اس پمفلٹ کو بالکل لاگت پر فروخت کرے چنانچہ نیوز پرنٹ پر اس کی قیمت ۱۰ روپے سینکڑہ اور سفید کاغذ پر ۱۲ روپے سینکڑہ مقرر کی گئی ہے میں تمام ان حضرات سے جو اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں یہ اپیل کرتا ہوں کہ اس کو کثرت سے پھیلائیں۔ ہر کالج، ہر مدرسے، ہر دفتر، ہر دوکان اور ہر کارخانے میں اسے پہنچائیں۔ کوئی پڑھا لکھا آدمی نہ چھوڑیں جس کی نگاہ سے یہ نہ گزر جائے۔ اور پڑھے لکھے لوگ دیہات اور شہروں میں ان پڑھ عوام کو اسے سنائیں اور اس کا مطلب سمجھائیں تاکہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک بڑی گمراہی سے بچ سکے۔ وَمَا تَوْفِيقُنَا إِلَّا بِاللَّهِ الْعَظِيمِ

ابوالاعلیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

عمر کے بالکل ابتدائی مراحل میں کسی کتاب میں ایک کہانی پڑھنے کا اتفاق ہُوا تھا کہ ایک بادشاہ کو نئے نئے لباس پہننے کا بہت زیادہ شوق تھا اور اُس کے اِس شوق نے جنون کی صورت اختیار کرلی تھی۔ وہ امورِ سلطنت سے بالکل غافل ہوکر اپنا زیادہ وقت کپڑوں کے نئے نئے ڈیزائن تیار کروانے میں صرف کرتا۔ بادشاہ کی اس کمزوری کا ملک بھر میں عام چرچا ہُوا چنانچہ جو لوگ اس فن میں مہارت رکھتے تھے انھوں نے اپنی ہنرمندی کے جوہر دکھا کر بادشاہ سے بہت زیادہ انعام واکرام وصول کیے۔

ایک دن بادشاہ کے پاس کپڑے بُننے والوں کا ایک نہایت ہی عیّار گروہ آیا اور عرض کی کہ "جہاں پناہ! ہم حضور کے لیے ایک ایسا کپڑا تیار کریں گے جس کی نظیر تاریخِ عالم نہ ملے گی"۔ اُن کا یہ دلفریب اور بلند بانگ دعویٰ سن کر بادشاہ بہت متاثر ہوا اور اُس نے اُن سے شرائط طے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ انھوں نے بادشاہ سے گذارش کی کہ "حضور ہمارے کپڑے کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہ ہر کہ ومہ کو نظر نہیں آتا۔ اسے صرف اصحابِ عقل وبصیرت ہی دیکھ سکتے ہیں" بادشاہ نے انہیں ایک کثیر رقم عطا کی اور انہیں کام شروع کرنے کا حکم دیا۔ اُس عیّار گروہ نے کھڈیاں خریدیں اور بغیر تانے بانے کے اُن پر زور زور سے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے جیسے کہ وہ کوئی غیر معمولی محنت ومشقت اٹھا رہے ہیں۔ جب انہیں کام کرتے کرتے ایک عرصہ گذر گیا اور اُن کے بھاری بھرکم معاوضوں سے خزانہ خالی ہونے لگا تو بادشاہ کو فکر دامنگیر ہوئی اور وہ درباریوں کو ساتھ لے کر اُس کارخانے میں گیا اُس نے وہاں جاکر دیکھا کہ ہر طرف سے کھٹا کھٹ کی

آوازیں آرہی ہیں اور وہ ہمہ تن کام میں مصروف ہیں۔ بادشاہ کو دیکھ کر وہ تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے اور ہاتھ باندھ کر عرض کی "حضور خود ہی ملاحظہ فرمالیں کہ ہم کتنا عمدہ کپڑا بُن رہے ہیں"۔ بادشاہ اور درباریوں کو اگرچہ کپڑا نظر تو نہ آتا تھا لیکن محض اس خوف سے کہ اگر اس کے وجود کا انکار کیا گیا تو اُن پر حماقت اور بیوقوفی کا الزام لگ جائے گا، اُن میں سے ہر ایک نے اس "عجیب و غریب کپڑے" کی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تعریف و توصیف کرنی شروع کی۔

کپڑے بُننے والوں کے اس عیّار گروہ کی جگہ مغربی اقوام رکھ لیں، بادشاہ کی جگہ امّتِ مسلمہ سمجھ لیں اور "حماقت" کے الزام کو رجعت پسندی کے الزام پر قیاس کر لیں تو آپ کو ملّتِ بیضا کی اصل بیماری فوراً معلوم ہو جائے گی۔ ہم محض اس خوف سے کہیں مغربی دنیا ہمیں قدامت پسند نہ کہہ بیٹھے اُس احمق بادشاہ کی طرح مغرب کی ہر بات کی بے جانے بوجھے تصدیق کرتے چلے جاتے ہیں۔ مغربی تمدّن اپنے ساتھ جس قسم کی برائیاں اور جس قسم کے مصائب لایا ہے انھوں نے پوری دنیا کو جہنّم بنا رکھا ہے۔ مادیت پرستی نے انسانیت کی ساری ارفع و اعلیٰ اقدار کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اُس کے علم نے ایک نئے انداز کی جہالت اور اُس کی شائستگی نے بنی نوعِ انسان میں ایک نئی قسم کی وحشت پھیلائی ہے، اُس کی ترقی کی روشنی میں جہنم کی آنچوں کا اثر ہے اور اُن کی جلن کو یورپ کا ہر صاحبِ احساس اب بڑی شدّت سے محسوس بھی کر رہا ہے لیکن اُس کے عیار علمبرداروں نے ہماری دولت و ثروت، ہماری آزادی اور ہماری متاعِ ایمان کو لوٹنے کے لیے ہمارے ذہنوں میں اسی طور پر باطل خیال بٹھا دیا ہے کہ ہم میں سے جو لوگ یورپ کی ترقی کے ثنا خواں نہیں وہ لازمی طور پر دقیانوسی، رجعت پسند اور ماضی پرست ہیں۔ ہم یورپین تہذیب و تمدن کے بُرے اثرات اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہے ہیں

ہم پر اس کے علمبرداروں کے باطل دعووں کی حقیقت بھی واضح ہو چکی ہے، اور ان کے ہاتھوں سے جس طرح ہم برباد ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں، اُس کو بھی ہم نے پوری طرح جان لیا ہے پھر اس تہذیب نے جان و مال کے بے پناہ زیاں کے بعد انسانی اقدار کی صورت میں نوعِ بشری کو جو کچھ دیا ہے اُس کی قدر و قیمت کا بھی ہمیں پورا پورا اندازہ ہو گیا ہے، ان میں سے کوئی پہلو بھی اب ایسا نہیں جس کے بارے میں ہمیں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ لاحق ہو لیکن ہماری اخلاقی پستی اور بزدلی ملاحظہ ہو کہ ان سب حقائق کے سامنے آجانے کے بعد بھی مغربی تمدن کی تعریف میں محض اس لیے رطب اللسان ہیں کہ کہیں مغربی دنیا ہم پر "رجعت پسند" ہونے کا الزام نہ رکھ دے۔

چشمِ فلک نے اِس دھرتی پر اُس قوم سے زیادہ بدنصیب قوم کون سی دیکھی ہوگی جسے اللہ تعالیٰ نے پوری نوعِ بشری کی ہدایت و رہنمائی کا مقدس فرض سونپا ہو اور وہ خود گمراہ کن قوموں کی تقلید کے تحت باطل نظریات کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ وہ کسوٹی جس کی مدد سے لوگ کھرے اور کھوٹے کے درمیان تمیز کرتے ہیں وہ اگر خود ہی مِس خام سے متاثر ہو کر اپنی یہ صلاحیت کھو بیٹھے تو پھر دنیا میں اس سے زیادہ بے وقعت اور بے وزن چیز اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ غیروں کی اندھا دھند پیروی نے آج بدقسمتی سے دنیا کی اِس معتبر باشان قوم کو ذلت کی ایک ایسی پست سطح تک پہنچا دیا ہے جس کے بعد پستی کا اور کوئی تصوّر ممکن نہیں ہے۔ آج دنیا میں جانوروں کے گلوں کی بھی قدر و قیمت ہے، بے جان سکّے بھی اپنا ایک وزن رکھتے ہیں، مٹی پانی اور ہوا میں بھی اتنی کشش موجود ہے کہ وہ انسانی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکیں۔ آج اگر کوئی شئے سب سے زیادہ بے وزن اور ناقابلِ التفات ہے تو وہ انسانوں کی یہی بھیڑ ہے جسے لوگ "امت مسلمہ" کے نام سے یاد کرنے کے عادی ہیں۔ انسانیت کی تعمیرِ نو کے نئے جو نئے نئے

نقشے ترتیب دیئے جا رہے ہیں اُن میں قوموں کا تو ذکر ہی کیا درندوں اور پرندوں تک کے لئے جگہ موجود ہے لیکن اگر کسی کے لئے جگہ نہیں تو وہ یہی بدنصیب ملت ہے جس کے افراد کی تعداد لاکھوں، نہیں کروڑوں تک پہنچی ہے۔

اس کی یہ حالتِ زار شروع سے ایسی نہ تھی، پورے ایک ہزار سال تک دنیا کی قیادت و رہنمائی کا منصب اسی قوم کو حاصل رہا، اس نے تہذیب کے گیسو سنوارے، عقل کو چار چاند لگائے، انسانیت کو زندگی بخش اقدار عطا کیں اور اُسے حیوانیت کی سطح سے بلند ہو کر انسان کی حیثیت سے جینے کے آداب سکھائے۔ زمانہ پوری دس صدیوں تک اپنی رفتار کے لئے اس کے اشارۂ ابرو کا مرہونِ منت رہا۔ دنیا کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی میدانوں میں اس کی ایک ساکھ تھی اور اس کے فیصلے بہت بڑی اہمیت کے حامل ہوا کرتے تھے بلکہ اگر یہی کہا جائے کہ دنیا میں صرف اسی کے افکار و نظریات کا سکہ چلتا تھا۔ تو اس میں ذرہ برابر مبالغہ نہ ہوگا لیکن آج اس کے لئے عزت کا کوئی منصب اور مقام باقی نہیں رہا۔

جب ایک انسان گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اس ملت کی تباہی و بربادی پہ غور کرتا ہے تو وہ حیران ہوتا ہے کہ وہ قوم آج مغرب کی مادی تہذیب پر فریفتہ ہو کر اُس کے افکار و نظریات کی بھیک مانگنے میں مصروف ہے جس کا ماضی غزالی، رومی، ابن حنبل، ابن قیمؒ اور اسی قسم کے ہزاروں لاکھوں آفتابوں، ماہتابوں سے درخشاں رہا ہے، جس کے پاس عطار، اجمیری اور جنید جیسے اہلِ دل، ابنِ خلدون، البیرونی جیسے مؤرخ، حافظ و کندی جیسے علمائے طبیعی، ابن رشد جیسے فلسفی، بخاری و مسلم جیسے محدث، ابنِ تیمیہ اور ولی اللہ جیسے محقق، خالد، طارق اور محمد بن قاسم جیسے جرنیل، حضرت علی اور عمر بن عبدالعزیز جیسے اہلِ بصیرت، حضرت عثمان اور عبداللہ بن عمر جیسے پاکباز، حضرت صدیق اکبر اور حضرت عمر فاروق

جیسے حکمران اور سب سے بڑھ کر سلسلۂ نبوت کے آخری اور سب سے زیادہ الوالعزم تاجدار کی حیات طیبہ کا ایک ایک حرف محفوظ ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ رشد و ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری اور لافانی کتاب بھی موجود ہو۔ جس قوم کے پاس فکر و عمل کے یہ بیش بہا خزانے موجود ہوں وہ اگر دوسروں کی کاسہ لیسی کرنے لگے تو اس سے زیادہ افسوس اور عبرت کا مقام کیا ہو سکتا ہے۔ دنیا میں پستی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ لیکن اس قوم کی پستی کی کوئی حد نہیں اور الفاظ کا کوئی ڈھانچہ اس کے بیان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اُسے کیا کہیے ؟

آخر سوچیے کہ دنیا نے ہمیں کیوں اُن رفعتوں اور بلندیوں سے دھکیل کر ان پستیوں تک پہنچا دیا ہے جن پر دنیا کی کوئی باوقار قوم ایک لمحہ کے لئے بھی زندہ رہنا گوارا نہیں کر سکتی۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جن افکار و نظریات کے علمبردار تھے وہ زمانہ کا ساتھ نہ دے سکے اور اس لئے ابلق ایام نے ہمیں مجبوراً "گرد کی طرح پیچھے پھینک دیا یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم پر اُس احمق بادشاہ کی طرح "جدت" کا بھوت سوار ہوا اور دنیائے مغرب ہماری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہمیں اُلّو بناتی رہی۔ اُس نے ہمارے دل و دماغ میں یہ باطل خیال راسخ کر دیا کہ مغرب کے سارے اوہام الہامات ہیں اور جو قوم ان سے والہانہ عقیدت مندی کا تعلق نہیں رکھتی وہ کم عقل، جاہل اور رجعت پسند ہے اور ہم نے محض ان الزامات سے بچنے کے لئے مغربی تصورات کی تعریف و توصیف شروع کر دی۔ شکاری اگر "سادہ لوح" شکار کو پھانسنے کے لیے جال کے ایک ایک حلقے کی تعریف کرے تو اس کی وجہ ذہن میں آ سکتی ہے لیکن حیرت اُس شکار پر ہوتی ہے جو اپنی آنکھوں کے سامنے آزادی جیسی قیمتی متاع کو لٹتا ہوا دیکھے لیکن محض اس خوف سے کہ کہیں چالاک شکاری اس کے دامن پر "قدامت پسندی" کا الزام نہ چپکا دے وہ خود

ہی زنجیر کے اِن حلقوں کی مداح سرائی میں مصروف ہو جائے ۔

مغربی تہذیب کا کونسا ایسا نظریہ ہے جس کے برے نتائج تلخ حقائق کی صورت میں پوری دنیا کے سامنے نہیں آچکے۔ خود دنیائے مغرب کے اصحابِ بصیرت بھی ان کی تلخیوں سے کسی حد تک آشنا ہیں۔ لیکن اُن کے دماغ کا مغرورانہ احساس اعترافِ حقیقت میں ہمیشہ مانع رہتا ہے اور وہ اپنے اندر اُن حقائق کو کھل کر تسلیم کرنے کی جرأت نہیں پاتے۔ وہ اس معاملے میں ہمیشہ غیر معمولی رازداری سے کام لیتے ہیں لیکن اس ساری احتیاط کے باوجود حق بات کبھی نہ کبھی ان کی زبانوں سے نکل ہی جاتی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اہلِ مغرب کی قیادت و سیادت کا راز اسی بات میں مضمر ہے کہ دنیائے مشرق خصوصاً دنیائے اسلام میں اُن کے افکار و نظریات کی ہی برتری قائم رہے اور لوگ انہیں پر جانیں نثار کرتے رہیں اس لئے وہ اگر حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کریں تو اس کی بہرحال ایک وجہ ہے لیکن ہمیں تعجب اپنے بزرگوں کی اس طرزِ عمل پر ہوتا ہے جو مغربی اقدار کی بربادیوں کا نقشہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود ابھی تک انہیں سینے سے لگانے پر مصر ہیں اور جن جن ممالک سے وہ ان کے بُرے اثرات کو زائل کرنے کی قدرت و طاقت رکھتے ہیں وہاں بھی وہ انہیں عوام کی مرضی کے علی الرغم ان پر مسلط کرنے کے درپے ہیں۔ اس کی وجہ کچھ یہ نہیں کہ انہوں نے تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ کر ان اقدار کو ملک و ملت کے حق میں مفید اور نافع پایا ہے اس لئے وہ دیانتداری سے ملتِ مسلمہ کی خیر خواہی اسی میں دیکھتے ہیں کہ اسے ان اقدار کا پرستار بنایا جائے۔ ان جذبات میں سے کوئی جذبہ بھی ان کے اندر کام نہیں کر رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت ملتِ بیضا پر ادبار کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں لیکن ہماری عقل یہ ماننے پر آمادہ نہیں ہوتی کہ اس گئی گزری حالت میں بھی ہماری سربراہی کا منصب ایسے عقل کے اندھوں کو حاصل ہے جو مغربی تہذیب کی ناکامی اور بربادی کے سامنے آجانے کے

بعد بھی اُسے ابھی پوری طرح سمجھ نہیں پائے۔ ہمارے نزدیک اُن کی مغربی تہذیب و تمدن سے وابستگی کا اصل سبب، فہم کی کمی نہیں بلکہ جرأت کی کمی ہے۔ یہ حضرات اُس بے عقل بادشاہ کی طرح اصل صورت حال سے تو پوری طرح واقف ہیں اور دل کی گہرائیوں میں یہ بات جانتے ہیں کہ اُن کی ملت کو ترقی اور روشن خیالی کے نام پر لوٹا جا رہا ہے۔ لیکن وہ اس سے غیر معمولی شیفتگی کا اظہار صرف اس لئے فرما رہے ہیں کہ عیّار لوگوں نے اُن کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ جو شخص اس تہذیب کا مداح نہیں وہ رجعت پسند ہے۔ اس لئے یہ سادہ لوح محض اس الزام سے بچنے کے لئے اس پر جان چھڑک رہے ہیں۔

اب ہماری ان معروضات پر صرف ایک مثال یعنی اتحادِ قومی کے لئے صحیح اساس کی روشنی میں غور فرمائیں۔ جو حضرات تاریخ سے معمولی واقفیت بھی رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسیحیت جب یورپ میں پہنچی تو اگرچہ وہ اپنی اصلی شکل میں نہ تھی اور اُس میں مختلف قسم کی خامیاں پیدا ہو چکی تھیں لیکن اس حالت میں بھی اُس میں حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کے اثرات اور آسمانی تعلیمات کی چند خصوصیات بہرحال موجود تھیں۔ مذہب خواہ کتنا بگڑ جائے لیکن وہ انسانوں کے درمیان رنگ، نسل اور وطن کی تفریق کا قائل نہیں ہوتا، اس بنا پر مسیحیت نے یورپ کی مختلف اقوام کے درمیان دینی تعلق قائم کر کے انہیں ایک دین کے جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ اور اس طرح پورا یورپ ایک خاندان بن گیا۔ فکر و نظر کی اس دور رس تبدیلی کا اندازہ مسیحی علما کے اقوال سے ہوتا ہے مثلاً ٹرولین کہتا ہے کہ ہم ایک جمہوریت کو جانتے ہیں اور وہ پوری نوعِ بشری ہے اور یحییٰ کہتا ہے کہ ہمارا ایک وطن ہے جس کی بنا لفظ خدا سے پڑی ہے۔

جب لوتھر نے اپنی مشہور دینی اصلاحی تحریک شروع کی اور رومی کلیسا کی مخالفت میں جرمن قوم کو صف آرا کر کے اُسے شکست فاش دی تو قومیں مذہب کی جس سلک میں

منسلک تھیں وہ منتشر و متفرق ہو گئیں صنعتی انقلاب کے بعد مختلف اقوام کے اندر مسابقت اور رقابت کا جو جذبہ پیدا ہوا تو اُس سے یہ انتشار اور بھی افسوسناک صورت اختیار کر گیا اور دنیا کی ہر قوم نے خاک وطن سے قومی وحدت کا کام لینے کی کوشش کی۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ یہ اساس وسیع ہوتی چلی گئی اور معاملہ خاک وطن سے گزر کر رنگ و نسل تک جا پہنچا سیاسیات کا ہر طالب علم اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ قومیت کی تشکیل میں مثبت اور منفی دونوں قسم کے جذبات کام کرتے ہیں مثبت جذبات کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کے مختلف افراد کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا ہو اور منفی جذبات اس قوم کو دوسری اقوام سے ممیز کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اہل مغرب نے مثبت جذبات کے لئے تو خاک وطن، رنگ اور نسل سے کام لیا۔ لیکن چونکہ اُن کے پاس کوئی روحانی اور اخلاقی قدر ایسی نہ تھی جس کی بنا پر وہ دوسری اقوام سے اپنے آپ کو ممیز اور ممتاز کرتیں اس لئے انہوں نے دوسروں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کر کے اپنے گرد قومی دیواریں چنیں۔ چنانچہ نفرت اور خوف آج قومی زندگی کے ایسے ضروری عناصر قرار پائے ہیں جن کے بغیر اس میں جان نہیں آتی۔ قوم پرستی کا جوش اُس وقت تک پوری طرح کام نہیں کرتا جب تک کہ قوم کے سامنے کوئی چیز نفرت کرنے کے لئے نہ ہو۔ اس بنا پر قومی رہنما اس بات کا پورا پورا التزام کرتے ہیں کہ قوم کے یہ منفی جذبات کسی طرح سرد نہ پڑنے پائیں اور وہ جس لمحہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے اندر کمی واقع ہو رہی ہے تو وہ فوراً اس دکھتی رگ کو دبا کر اس میں ہیجان اور اشتعال اور جوش و خروش پیدا کر دیتے ہیں)۔

خاک وطن، رنگ اور نسل نے آج سے نصف صدی پیشتر تو قومی وحدت کے لئے ایک بری بھلی بنیاد فراہم کر دی تھی لیکن ہمارے اس دور میں زمان و مکان کی تسخیر کی وجہ سے زمین کے مختلف گوشے جس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ایک دوسرے کے

قریب سمٹ کر آرہے ہیں اُس نے اس بنیاد کو بالکل ناکارہ بنا کر رکھ دیا ہے اور اب دنیا اس بات کے لیے مجبور ہوگئی ہے کہ قومیت کی تشکیل کے لیے ان سے وسیع تر بنیادیں تلاش کرے۔ چنانچہ آج انسان معاشی اور سیاسی مفادات پر مجتمع ہو رہے ہیں لیکن پچھلے چند سال کے واقعات نے اس حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے کہ یہ نئی اساس پہلی بنیادوں سے بھی زیادہ کھوکھلی اور بیکار ہے۔ انسانوں کو دوسرے سے منسلک کرنے اور انہیں ایک قوم بنانے کے لئے ایک ایسا رشتہ درکار ہے جو اُن کے مابین ایک قلبی تعلق اور لگاؤ پیدا کر کے اُن کے اندر فکری اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ وطن، رنگ اور نسل میں یہ صلاحیت کسی قدر موجود ہے لیکن معاشی اور سیاسی مفادات میں ایسی کوئی کشش نہیں جو لوگوں کے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر انہیں ایک وحدت بنا دے۔ معاشی مفادات انسانوں کے اندر ہمیشہ رقابت اور منافرت کے جذبات ابھار کر انہیں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ آج دنیا میں جو فتنہ و فساد، کشت و خون اور قتل و غارت ہو رہا ہے وہ سب اسی معاشی رقابت کا نتیجہ ہے۔

اب دنیا حالات کے ہاتھوں اس بات پر مجبور ہوگئی ہے کہ وحدت قومی کے لیے کوئی ایسی بنیاد مہیا کرے جو روحانی اور اخلاقی ہو اور یہ ایک ایسی ضرورت ہے جسے دنیا کا ہر صاحبِ عقل اور صاحبِ احساس آج بڑی شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے۔ چنانچہ عہدِ حاضر کا سب سے زیادہ مشہور مؤرخ پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی اسی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

> اس دنیا میں جب کہ سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے دُنیا کی
> طنابیں کھینچ کر اُسے ایک گھر بنا دیا ہے۔

جبکہ پوری نوع بشری کو ایک سلک میں منسلک کرنے کے لئے مغربی طرزِ زندگی کے درمیان زبردست مسابقت جاری ہے' ---- ان حالات میں اخوتِ انسانی کی اسلامی روایات، مغرب کی منفرق اور آزاد ریاستوں کے طور طریقوں کی بہ نسبت ہمارے عہد کی معاشرتی ضرورت کو احسن طریق سے پورا کر سکتی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد دنیائے مغرب جن حالات سے گزر رہی ہے اُس میں اس چیز کا ہر وقت خطرہ لاحق ہے کہ یہ جابیس آزاد ریاستیں اُس خاندان کی طرح برباد نہ ہو جائیں جس کے افراد کے درمیان سر پھٹول جاری ہو۔ بدقسمتی سے ابھی تک مغرب کا رعب داب لوگوں کے دلوں پر قائم ہے اور اس وجہ سے وہ قومیت کے زہر کو دوسری اقوام کے اندر منتقل کر رہا ہے تاہم مجھے یقین ہے کہ دنیائے اسلام میں بہرحال مغرب کے اس سیاسی جنون کے راستے میں اتحاد و اخوت کی اسلامی روایات فراہم ہونگی۔ آج نوع بشری کو ایک عالمگیر سیاسی اور معاشرتی وحدت کی ضرورت درپیش ہے اور انسانیت کے حفظ و بقا کے لئے یہ ضرورت ماضی میں کبھی اتنی شدید نہ تھی جتنا کہ ہم اسے اس ایٹمی دَور میں محسوس کر رہے ہیں

(دنیا اور مغرب ص ۳۰-۳۱)

اخوت انسانی، یا انسانیت کے لئے ایک اخلاقی اور روحانی وحدت ایک ایسا تقاضا ہے جس سے دنیا کا کوئی صاحب بصیرت صرف نظر نہیں کر سکتا۔ وقت آپ ہی پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وطن، رنگ اور نسل کی جنگ حدود سے نکل کر نوعِ بشری کی تنظیم کے لئے کوئی وسیع تر بنیاد تلاش کرو۔ ان حالات کے پیش نظر یہ تو ممکن ہے کہ امت مسلمہ کے سربراہ روشن خیالی اور ترقی پسندی کی بنا پر اسلام کے

تقاضوں سے غافل ہوں لیکن ہم اُن کے بارے میں ایک لمحہ کے لیئے بھی سوئے ظن نہیں رکھ سکتے کہ جو لوگ وقت کے تقاضوں کے تحت اسلام کی ازلی و ابدی تعلیمات تک کو بدل دینے کے درپے ہیں اور جنہیں ضبط تولید، آرٹ، کلچر، اختلاط مرد و زن زبان، رسم الخط، الغرض فکر و عمل کی معمولی سے معمولی جزئیات تک کے معاملے میں وقت کے تقاضوں کا شدید پاس ہے، وہ وقت کی اس سب سے بڑی اور اہم ضرورت سے ناواقف ہوں گے۔ وہ یقیناً حالات کے اشاروں کو پوری طرح جانتے ہیں، لیکن انہیں جاننے کے باوجود اُس احمق بادشاہ کی طرح محض اس لیئے حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے کہ مغرب کے روشن دماغوں نے ابھی اپنی حیات اجتماعی کی تشکیل اسلام کی روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر نہیں کی اور ابھی یہ کھٹکا موجود ہے کہ اگر ملّتِ بیضا نے کہیں یہ حرکت کر دی تو اُس پر شاید مغرب کی بعض ترقی پسند اقوام کی طرف سے رجعت پسندی کا الزام لگایا جائے۔ ہم در اصل یورپین قوموں سے بھی زیادہ روشن خیال کہلانا چاہتے ہیں اس لیئے کوئی ایسا قدم اٹھانے کے لیئے تیار نہیں جس سے دوسروں کو ہماری قدامت پسندی کا شبہ بھی ہونے پائے۔

پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی، پروفیسر سارو کن، لارڈ لوتھین، جوڈ اور اسی قبیل کے دوسرے علما اگر انسانیت کی روحانی وحدت کا تذکرہ کریں تو یہ ان کی اپنی تحقیق ہے لیکن ہم اپنی ملت کے مائل بہ انتشار اجزا کو دینی رشتے سے جوڑنے کے لیئے تیار نہیں کیونکہ سارے روشن خیالوں نے ابھی اس رشتے کو تسلیم نہیں کیا اور اُن کے تسلیم کیئے بغیر ہمارا اسے تسلیم کر لینا ہماری رجعت پسندی پر دلالت کرتا ہے اور یہ وہ الزام ہے جس سے بچنے کے لیے ہم نے اپنی انفرادیت تک کی قربانی دے دی ہے۔ مصر، ترکی، عراق، ایران میں ہم نے اسلام کا رشتہ اخوت توڑ کر، وطن، رنگ و نسل کی بنیاد پر

اپنی قومیت کی تشکیل کرتے ہیں جس قسم کی احمقانہ کوشش کی ہے وہ ایک بڑی ہی لغو داستان ہے۔

امیر شکیب ارسلان جو ترکی کے حالات سے بہت باخبر اور ترکی جدید کے بانیوں سے ذاتی طور پر واقف ہیں۔ انہوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف حاضر العالم الاسلامی میں اس کی کچھ تفصیل بیان کی ہے۔ ترکی کی وہ جماعت جو اسلامی قومیت کی حامی تھی اس کے مقابلے میں کوک الپ، احمد آغا ئف، یوسف آقشورا، جلال ساھر کی فکری رہنمائی میں ایک ایسی جماعت تیار کی گئی جس میں زیادہ تر طلبا اور نوجوان شامل تھے ان لوگوں نے دنیا کے سامنے برملا کہا کہ طورانی نسل نے انہیں ایک رشتہ میں منسلک کیا ہے وہ پہلے ترک ہیں، پھر مسلمان، اسلام کی ان کے نزدیک صرف اسی قدر اہمیت ہے کہ وہ طورانی قومیت کے لئے کچھ مفید ثابت ہوا ہے۔ طورانیت کے معاملے میں اُن کے غلو کا یہ عالم ہے کہ اُن میں سے بعض من چلے یہ کفر تک کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ ہمارا کعبہ صرف طوران ہے۔ وہ علانیہ اُس ظالم اور ستمگر فرمانروا کی تعریف کے گیت گاتے ہیں جسے دنیا چنگیز کے نام سے یاد کرتی ہے۔ بچوں کے لئے ایسی نظمیں تیار کی گئیں جن میں اس کے کارناموں کو اچھالا گیا اور پستی کی انتہا ہے کہ وہ قوم جس کی پیشانی خدا کے سوا کسی کے سامنے نہ جھکتی تھی وہ سفید بھیڑیے کی تقدیس بیان کرنے میں مصروف ہوئی کیونکہ انہیں تاریخ کی چھان بین سے یہ معلوم ہوا تھا کہ ان کے طورانی آباؤ اجداد اسلام سے پہلے سفید بھیڑیے کے سامنے سر نیاز خم کیا کرتے تھے۔ اس سفید بھیڑیے کی بعض نئی کتابوں میں تصویریں بھی دی گئیں۔ علامہ شکیب ارسلان فرماتے ہیں کہ مجھ سے شیخ الاسلام موسیٰ کاظم مرحوم نے بیان کیا کہ میں نے ان نوجوانوں سے کہا عرب بھی بہت سی ایسی پست اور ادنیٰ چیزوں کی عبادت کرتے تھے۔ لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے توبہ کی اور اس بات پر فخر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بڑا احسان کیا ہے۔

کہ انہیں اس سے نجات دی اور کفر و شرک کی پستیوں اور ضلالتوں سے نکال کر انہیں توحید جیسی نعمت سے لذت آشنا کیا۔ حیف ہے تم پر کہ تم خدائے لم یزل کو چھوڑ کر سفید بھیڑیے جیسے ذلیل درندے کی عبادت کو زندہ کرنے کا عزم رکھتے ہو۔

بعینہٖ قومیت کا یہی جذبہ ایران، اور بہت سے دوسرے مسلم ممالک میں کارفرما ہے۔ ایرانی نوجوانوں کے دماغ میں قدیم ایرانی تہذیب کے احیاء کا سودا سمایا ہوا ہے اور اب وہ اسلام کے سرمدی پیغام سے منہ موڑ کر آتش پرست، کیومرث، ثنویت، زرتشت اور مانویت کو زندہ کرنے میں مصروفِ عمل ہیں، ایرانی ادب میں سے چن چن کر اُن شعراء اور ادباء کو نکالا جا رہا ہے جو اسلام کی اخلاقی تعلیمات کے علمبردار تھے اور ان کی جگہ ان لوگوں کے افکار و نظریات کی ترویج و اشاعت کی کوشش ہو رہی ہیں۔ جنہوں نے آگ اور اسی طرح کے دوسرے مظاہرِ قدرت کے ساتھ رشتہ عبودیت استوار کر رکھا تھا۔

عرب ممالک بھی قومیت کی اسی لعنت میں بُری طرح گرفتار ہیں۔ وہاں کبھی وطن کی بنیاد پر عربوں کے اندر جذباتی ہم آہنگی پیدا کی جاتی ہے اور کبھی زبان کی اساس پر اُن کے درمیان رشتۂ اخوت قائم ہوتا ہے لیکن یہ ساری بنیادیں اتنی کمزور اور بودی ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی مستقل اور پائیدار ثابت نہیں ہوتی اور ریت کے گھروندوں کی طرح منہدم ہو رہی ہیں۔

اس امت کی اس سے زیادہ سیاہ بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ امت جس نے آج سے چودہ سو برس پیشتر وطن، رنگ، نسل اور زبان کے مادی رشتوں کو توڑ کر دنیا پر یہ حقیقت ثابت کر دی تھی کہ انسان بنیادی طور پر اخلاقی اور روحانی احساسات کا حامل ہے۔ اس لئے ہر مادی اساس انسان کو دوسرے سے قریب کرنے اور اسے رشتۂ اخوت میں

منسلک کرنے میں ناکام ہوگی، وہ امّت جس نے نوعِ بشری کو یہ سبق دیا تھا کہ اُس کے درمیان اگر تفریق ہو سکتی ہے تو وہ صرف حق پرستوں اور شیطان کے پجاریوں کے درمیان ہو سکتی ہیں، اور اس ایک تفریق کے علاوہ جو تفریق بھی ہوگی وہ سراسر باطل اور غلط ہوگی۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات ۲)	اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنا دیا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ۔ مگر درحقیقت معزز تو تم میں وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

وہ امّت جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بہترین امّت بنا کر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل عظیم الشان کام سپرد کیا تھا اُس کا آج یہ حال ہو گیا ہے کہ اُس کے نوجوان مصر کے اندر خدا و رسول کے نہایت ہی گھٹیا دشمن فرعون کے کارناموں کو اچھالنے میں مصروف ہیں اور اُسے اپنا ایک قابلِ فخر ہیرو سمجھنے لگے ہیں۔ آپ احادیث، وغیرہ کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھیں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ حضور سرورِ کائنات نے کس طرح خون اور خاک، رنگ اور زبان اور اسی نوع کی دوسری قومی اور وطنی عصبیتوں کو مٹایا اور انسان اور انسان کے درمیان غیر فطری امتیازات کی تمام سنگین دیواریں مسمار کیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے واشگاف الفاظ میں ارشاد فرمایا:۔

لَيْسَ منا من مات على العصبية	جس نے عصبیت پر جان دی وہ ہم میں سے نہیں ہے
ليس منا من دعى على العصبية	جس نے عصبیت کی طرف بلایا وہ ہم میں سے نہیں ہے
ليس منا من قاتل على العصبية	جس نے عصبیت پر جنگ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے

فتح مکّہ کے بعد جب تلوار کے زور سے قریش کی اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکا دیا، تو حضور سرورِ دوعالم خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور اس میں پورے زور کے ساتھ یہ اعلان فرمایا:۔

خوب سن رکھو کہ فخر و ناز کا ہر سرمایہ، خون اور مال کا ہر دعویٰ آج میرے ان قدموں کے نیچے ہے۔ اے اہلِ قریش اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کر دیا ہے۔ اے لوگو: تم سب آدم سے ہو اور آدم مٹی سے تھے، نسب کے لئے کوئی فخر نہیں ہے، عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں ہے، تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

آنکھیں خون کے آنسو رلاتی ہیں جب ایک انسان یہ سوچتا ہے کہ وہ امّت جو دنیا سے رنگ و نسل کے امتیازات مٹانے کا عزم لے کر اٹھی تھی اور جس نے اس عالم میں انسان اور انسان کے درمیان سارے مصنوعی امتیازات ختم کر کے انسانوں کے مابین روحانی اور اخلاقی تعلق قائم کیا تھا وہ آج اِن غیر اسلامی امتیازات کو اُبھارنے میں مصروف کار ہے اور انہیں کے بل بوتے پر دنیا میں زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے خواب دیکھتی ہے۔ خدا اور رسول کے احکام سے تغافل تو تھا ہی لیکن کیا مغرب کی اندھی پیروی نے ہماری فکری صلاحیتوں کو اس حد تک ماؤف کر دیا ہے اور ہمیں اتنا بے حس اور بے بصیرت بنا دیا ہے کہ اب ہم میں وقت کے ان تقاضوں کو سمجھنے کی بھی قوت باقی نہیں رہی جن پر ہم اپنی قیمتی سے قیمتی متاع قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ کیا اب ہمیں سوائے ناچ، گانے عیش و طرب، اور لہو و لعب کے وقت کا اور کوئی تقاضا نظر نہیں آتا۔

اس قوم کی مظلومیت اب اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ خود ان ظالموں کو، جن کے اندر احساس کی کوئی رمق باقی ہے، اس کی بے کسی اور بے بسی پر ترس آنے لگا ہے۔ اور عین نزع کے عالم میں جب کہ اس امّت کی روح کا رشتہ اس کے جسم سے منقطع ہونے

والا ہے، خود دشمنوں میں سے صاحبِ احساس لوگ اس کی اس حالت زار کو دیکھ کر اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر کہہ رہے ہیں۔ اے بدنصیب لوگو! ذرا آنکھ کھول کر اُس امرت رس کو تو دیکھو جس کی تلاش میں آج پوری نوع بشری سرگرداں ہے۔ ہمیں تو اسے قبول کرنے میں بہرحال تردد اور تامل ہے۔ کیونکہ ہم اسے ابھی اپنے مزاج کے مطابق نہیں پاتے ابھی ہمارے راستے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں اور ان میں سب سے بڑی رکاوٹ خود تمہاری یہ ناگفتہ بہ حالت ہے لیکن ہم جب تمہاری داستانِ حیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس امرت رس سے لذت آشنا ہو کر تمہیں نہ صرف قوت و طاقت اور اقبال مندی کی دولت ہاتھ آئی تھی بلکہ نوعِ انسانی کی سچی، بے لوث خدمت کا شرف بھی حاصل ہوا تھا اسی سلسلہ میں آپ اسی مغربی مفکر کا دل سوز بیان ملاحظہ فرمائیں جس کا ذکر ہم گذشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔

"بہت سے مغربی افکار و نظریات اور ادارے ایسے ہیں جن کا نوعِ انسانی کے حق میں خیر و برکت کا موجب ثابت ہونا محل نظر ہے اور ان نظریات میں ایک ہمارا قومیت کا مغربی تصور ہے۔ ترک اور بہت سی دوسری مسلمان قوموں میں مغرب کے دوسرے نظریات کی طرح اس نظریہ کا زہر بھی بڑی تیزی کے ساتھ سرایت کر رہا ہے ان حالات میں میرے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا ہے کہ آخر یہ ملت جس کی درخشاں اور تابندہ روایات میں یہ چیز شامل ہے کہ مسلمان خواہ کسی نسل، رنگ یا خطۂ ارضی سے تعلق رکھتا ہو، وہ دینی رشتہ کی بنا پر دوسرے کا بھائی ہے۔ اس کے بدن میں جب تنگ نظری اور تعصب کے اس نظریہ کا زہر پھیلے گا تو وہ بالآخر کس حسرتناک انجام سے دوچار ہو گی۔

تفہیم القرآن

الاحزاب

(۶)

اے نبیؐ،[۸۱] ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر،[۸۲] بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر،[۸۳]

۸۱ مسلمانوں کو نصیحت کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کو خطاب کر کے چند کلماتِ تسکین ارشاد فرماتا ہے۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ آپ کو ہم نے یہ کچھ مراتبِ عالیہ بخشے ہیں، آپ کی شخصیت اس سے بہت بلند ہے کہ یہ مخالفین اپنے بہتان و افترا کے طوفان اٹھا کر آپ کا کچھ بگاڑ سکیں۔ لہٰذا آپ نہ ان کی شرارتوں سے رنجیدہ ہوں اور نہ ان کے پروپیگنڈے کو پرِکاہ کے برابر بھی کوئی وقعت دیں۔ اپنے فرائضِ منصبی ادا کیے جائیے اور انہیں جو کچھ ان کا جی چاہے بکنے دیجیے۔ اس کے ساتھ ضمناً تمام خلق کو، جس میں مومن و کافر سب شامل ہیں، یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا سابقہ کسی معمولی انسان سے نہیں ہے بلکہ ایک بہت بڑی شخصیت سے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بلند ترین مقام پر سرفراز فرمایا ہے۔

۸۲ نبیؐ کو "گواہ" بنانے کا مفہوم اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے جس میں تین قسم کی شہادتیں شامل ہیں:-

ایک قولی شہادت، یعنی یہ کہ اللہ کا دین جن حقائق اور اصولوں پر مبنی ہے، نبیؐ ان کی صداقت کا گواہ بن کر کھڑا ہو اور دنیا سے صاف صاف کہہ دے کہ وہی حق ہیں اور ان کے خلاف جو کچھ ہے باطل ہے خدا کی ہستی اور اس کی توحید، ملائکہ کا وجود، وحی کا نزول، حیات بعد الموت کا وقوع اور جنت و دوزخ کا ظہور خواہ دنیا کو کیسا ہی عجیب معلوم ہو اور دنیا ان باتوں کے پیش کرنے والے کا مذاق اڑائے یا اسے

دیوانہ کہے، مگر نبی کسی کی پرواہ کیے بغیر اٹھے اور ہانک پکار کر کہہ دے کہ یہ سب کچھ حقیقت ہے اور گمراہ ہیں وہ لوگ جو اسے نہیں مانتے۔ اسی طرح اخلاق اور تہذیب اور تمدن کے جو تصورات، اقدار، اصول اور ضابطے خدا نے اس پر منکشف کیے ہیں، انہیں اگر ساری دنیا غلط کہتی ہو اور ان کے خلاف چل رہی ہو تب بھی نبی کا کام یہ ہے کہ انہی کو علی الاعلان پیش کرے اور اُن تمام خیالات اور طریقوں کو غلط قرار دے جو ان کے خلاف دنیا میں رائج ہوں۔ اسی طرح جو کچھ خدا کی شریعت میں حلال ہے نبی اس کو حلال ہی کہے، خواہ ساری دنیا اسے حرام سمجھتی ہو، اور جو کچھ خدا کی شریعت میں حرام ہے نبی اس کو حرام ہی کہے خواہ ساری دنیا اسے حلال و طیب قرار دے رہی ہو۔

دوسرے عملی شہادت، یعنی یہ کہ نبی اپنی پوری زندگی میں اُس مسلک کا عملاً مظاہرہ کرے جسے دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے وہ اٹھا ہے۔ جس چیز کو وہ برائی کہتا ہے اُس کے ہر شائبہ سے اس کی زندگی پاک ہو۔ جس چیز کو وہ بھلائی کہتا ہے اس کی اپنی سیرت میں وہ پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ جس چیز کو وہ فرض کہتا ہے اسے ادا کرنے میں وہ سب سے بڑھ کر ہو۔ جس چیز کو وہ گناہ کہتا ہے اس سے بچنے میں کوئی اس کی برابری نہ کر سکے۔ جس قانونِ حیات کو وہ خدا کا قانون کہتا ہے اسے نافذ کرنے میں وہ کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔ اس کا اپنا اخلاق و کردار اس بات پر گواہ ہو کہ وہ اپنی دعوت میں کس قدر سچا اور کتنا مخلص ہے۔ اور اس کی ذات اس کی تعلیم کا ایسا مجسم نمونہ ہو جسے دیکھ کر ہر شخص معلوم کرے کہ جس دین کی طرف وہ دنیا کو بلا رہا ہے وہ کس معیار کا انسان بنانا چاہتا ہے، کیا کردار اُس میں پیدا کرنا چاہتا ہے، اور کیا نظامِ زندگی اُس سے برپا کرانا چاہتا ہے۔

تیسرے اُخروی شہادت، یعنی آخرت میں جب اللہ کی عدالت قائم ہو اس وقت نبی اس امر کی شہادت دے کہ جو پیغام اس کے سپرد کیا گیا تھا وہ اس نے بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دیا اور ان کے سامنے اپنے قول اور عمل سے حق واضح کر دینے میں اس نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اسی شہادت پر یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ ماننے والے کس جزا کے، اور نہ ماننے والے کس سزا کے مستحق ہیں۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہادت کے مقام پر کھڑا کر کے

اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی ذمہ داری آپ پر ڈالی تھی اور وہ کیسی عظیم شخصیت ہونی چاہیے جو اس مقام بلند پر کھڑی ہو سکے ظاہر بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دینِ حق کی قولی اور عملی شہادت پیش کرنے میں ذرہ برابر بھی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے۔ تبھی تو آخرت میں آپ یہ شہادت دے سکیں گے کہ میں نے لوگوں پر حق پوری طرح واضح کر دیا تھا، اور تبھی اللہ کی حجت لوگوں پر قائم ہو گی۔ ورنہ اگر معاذ اللہ آپ ہی سے یہاں شہادت ادا کرنے میں کوئی کسر رہ گئی ہو تو نہ آپ آخرت میں اُن پر گواہ ہو سکتے ہیں اور نہ منکرینِ حق کے خلاف مقدمہ ثابت ہو سکتا ہے۔

بعض لوگوں نے اس شہادت کو یہ معنی پہنانے کی کوشش کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخرت میں لوگوں کے اعمال پر شہادت دینگے، اور اس سے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ حضورؐ تمام لوگوں کے اعمال کو دیکھ رہے ہیں، ورنہ بے دیکھے شہادت کیسے دے سکیں گے۔ لیکن قرآن مجید کی رو سے یہ تاویل قطعاً غلط ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ لوگوں کے اعمال پر شہادت قائم کرنے کے لیے تو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرا ہی انتظام فرمایا ہے۔ اس غرض کے لیے اُس کے فرشتے ہر شخص کا نامۂ اعمال تیار کر رہے ہیں (ملاحظہ ہو ق آیات ۱۷-۱۸- اور الکہف- آیت ۴۹) اور اس کے لیے وہ لوگوں کے اپنے اعضاء سے بھی گواہی لے لیگا (یٰسٓ ۶۵ حٰمٓ السجدہ ۲۰-۲۱)۔ رہے انبیاء علیہم السلام، تو ان کا کام بندوں کے اعمال پر گواہی دینا نہیں بلکہ اس بات پر گواہی دینا ہے کہ بندوں تک حق پہنچا دیا گیا تھا۔ قرآن صاف فرماتا ہے:

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (المائدہ- ۱۰۹)

جس روز اللہ تمام رسولوں کو جمع کریگا، پھر پوچھیگا کہ تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا گیا، تو وہ کہیں گے کہ ہم کو کچھ خبر نہیں، تمام غیب کی باتوں کے جاننے والے تو آپ ہی ہیں۔

اور اسی سلسلے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ جب اُن سے عیسائیوں کی گمراہی کے متعلق سوال ہوگا تو وہ عرض کریں گے:

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ	میں جب تک ان کے درمیان تھا اسی وقت تک
فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ	اُن پر گواہ تھا۔ جب آپ نے مجھے اٹھا لیا تو
الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ۔ (المائدہ - ۱۱۷)	آپ ہی ان پر نگراں تھے۔

یہ آیات اس باب میں بالکل صریح ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اعمالِ خلق کے گواہ نہیں ہوں گے۔ پھر وہ گواہ کس چیز کے ہوں گے؟ اس کا جواب قرآن اتنی ہی صراحت کے ساتھ یہ دیتا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا	اور اے مسلمانو، اسی طرح ہم نے تم کو ایک امتِ
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ	وسط بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر
الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (البقرہ: ۱۴۳)	گواہ ہو۔
وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا	اور جس روز ہم ہر امت میں انہی کے اندر سے
عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا	ایک گواہ اٹھا کھڑا کریں گے جو ان پر گواہی دیگا
عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ۔ (النحل - ۸۹)	اور (اے محمدؐ) تمہیں ان لوگوں پر گواہ کی حیثیت سے لائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت اپنی نوعیت میں اُس شہادت سے مختلف نہ ہوگی جسے ادا کرنے کے لیے حضورؐ کی امت کو اور ہر امت پر گواہی دینے والے شہداء کو بلایا جائیگا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ شہادت اعمال کی ہو تو ان سب کا بھی حاضر و ناظر ہونا لازم آتا ہے۔ اور اگر یہ گواہ صرف اس امر کی شہادت دینے کے لیے بلائے جائیں گے کہ خلق تک اس کے خالق کا پیغام پہنچ گیا تھا تو لامحالہ حضورؐ بھی اسی غرض کے لیے پیش ہوں گے۔

اسی مضمون کی تائید وہ احادیث بھی کرتی ہیں جن کو بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ اور امام احمد وغیرہم نے عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس، ابوالدرداء، انس بن مالک اور بہت سے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے، جن کا مشترک مضمون یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے روز اپنے بعض اصحاب کو دیکھیں گے کہ وہ لائے جا رہے ہیں، مگر وہ آپ کی طرف آنے کے بجائے

اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا[۸۴] بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔ بشارت دے دو اُن لوگوں کو جو (تم پر) ایمان لاتے ہیں کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے۔ اور ہرگز نہ دبو کفار و منافقین سے، کوئی پروا نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی اور بھروسہ کر لو اللہ پر، اللہ ہی اس کے لیے کافی ہے کہ آدمی اپنے معاملات اُس کے سپرد کر دے۔

دوسرے رُخ پر خود جا رہے ہوں گے یا دھکیلے جا رہے ہوں گے۔ حضورؐ ان کو دیکھ کر عرض کریں گے کہ خدایا یہ تو میرے صحابی ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے بعد انھوں نے کیا کرتوت کیے ہیں۔ یہ مضمون اتنے صحابہ سے اتنی کثیر سندوں کے ساتھ نقل ہوا ہے کہ اس کی صحت میں کسی شبہہ کی گنجایش نہیں۔ اور اس سے یہ بات صریحاً ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے ایک ایک شخص اور اس کی ایک ایک حرکت کے شاہد قطعاً نہیں ہیں۔ رہی وہ حدیث جس میں یہ ذکر آیا ہے کہ حضورؐ کے سامنے آپ کی امت کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں، تو وہ کسی طرح بھی اِس مضمون سے متعارض نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضورؐ کو اُمت کے حالات سے باخبر رکھتا ہے۔ اس کے یہ معنی کب ہیں کہ حضورؐ ہر شخص کے اعمال کا عینی مشاہدہ فرما رہے ہیں۔

۸۳۔ یہاں اس فرق کو ملحوظ رکھیے کہ کسی شخص کا بطور خود ایمان و عمل صالح پر اچھے انجام کی بشارت دینا اور کفر و بدعملی پر بُرے انجام سے ڈرانا اور بات ہے اور کسی کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبشّر و نذیر بنا کر بھیجا جانا بالکل ہی ایک دوسری بات۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس منصب پر مامور ہو وہ تو اپنی بشارت اور اپنے اِنذار کے پیچھے لازماً ایک اقتدار رکھتا ہے جس کی بنا پر اس کی بشارتوں اور اس کی تنبیہوں کو قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کا کسی کام پر بشارت دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ جس احکم الحاکمین کی طرف سے وہ بھیجا گیا ہے وہ اس کام کے پسندیدہ اور مستحق اجر ہونے کا اعلان کر رہا ہے، لہٰذا وہ یقیناً فرض یا واجب یا مستحب ہے اور اس کا کرنے والا ضرور اجر پائے گا۔ اور اس کا کسی کام کے بُرے انجام کی خبر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ قادرِ مطلق اس کام سے منع کر رہا ہے لہٰذا وہ ضرور گناہ اور حرام ہے اور یقیناً اس کا مرتکب سزا پائے گا۔ یہ حیثیت کسی غیر مامور کی بشارت اور تنبیہ کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو تو تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کر سکو۔ لہٰذا انہیں کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔[۸۵]

[۸۴] یہاں بھی ایک عام مبلغ کی تبلیغ اور نبی کی تبلیغ کے درمیان وہی فرق ہے جس کی طرف اُوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ دعوت الی اللہ تو ہر مبلغ دیتا اور دے سکتا ہے، مگر وہ اللہ کی طرف سے اس کام پر مامور نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس نبی اللہ کے اِذن (Sanction) سے دعوت دینے اٹھتا ہے۔ اس کی دعوت نری تبلیغ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے بھی اس کے بھیجنے والے رب العالمین کی فرمانروائی کا زور ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے بھیجے ہوئے داعی کی مزاحمت خود اللہ کے خلاف جنگ قرار پاتی ہے، جس طرح دنیوی حکومتوں میں سرکاری کام انجام دینے والے سرکاری ملازم کی مزاحمت خود حکومت کے خلاف جنگ سمجھی جاتی ہے۔

[۸۵] یہ ایک منفرد آیت ہے جو غالباً اسی زمانے میں طلاق کا ایک مسئلہ بتانے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ اس لیے پچھلے سلسلۂ بیان اور بعد کے سلسلۂ بیان کے درمیان اس کو رکھ دیا گیا۔ اس ترتیب سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ یہ آیت تقریرِ ماسبق کے بعد اور تقریرِ مابعد سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

اس سے جو احکام نکلتے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱- یہ آیت اس باب میں صریح ہے کہ قرآن مجید نکاح کا لفظ بول کر صرف عقد مراد لیتا ہے، خواہ مباشرت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ اگرچہ لغتِ عرب میں نکاح کا لفظ عقد اور مباشرت دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، بلکہ مجرد مباشرت کے لیے بھی یہ لغت میں مستعمل ہے، لیکن قرآن اسے اصطلاحاً صرف عقد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ بس ایک مقام ایسا ہے جہاں نکاح سے مراد عقد اور مباشرت دونوں ہیں، یعنی سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۰ جس میں فرمایا گیا ہے کہ اگر شوہر کسی عورت کو تیسری بار طلاق دے دے تو وہ پھر اس مرد کے لیے حلال نہیں ہوتی جب تک وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کر لے۔ اس جگہ تحلیل کے لیے صرف عقدِ نکاح کافی نہیں ہے بلکہ حدیث کی رُو سے صرف وہی نکاح موجبِ تحلیل ہو سکتا ہے جس کے بعد مباشرت بھی ہوئی ہو۔

۲- اس حکم میں اگرچہ لفظاً صرف مومن عورتوں کے ساتھ نکاح کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے، لیکن تمام علمائے امت کا اس پر اتفاق ہے کہ معنًی یہی حکم کتابیات کے بارے میں بھی ہے۔ یعنی کتابی عورت سے بھی آدمی نے نکاح کیا ہو تو اس کی طلاق، اس کے مہر، اس کی عدت اور اس کو متعۂ طلاق دینے کے جملہ احکام وہی ہیں جو مومن عورت سے نکاح کی صورت میں ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مخصوص طور پر صرف مومن عورتوں کا ذکر جو کیا ہے اس سے مقصود اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ مسلمانوں کے لیے مومن عورتیں ہی موزوں ہیں۔ کتابی عورت سے نکاح جائز ضرور ہے مگر مناسب اور پسندیدہ نہیں ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن کے اس اندازِ بیان سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اہلِ ایمان سے متوقع یہی ہے کہ وہ مومن عورتوں سے نکاح کریں گے۔

۳- "ہاتھ لگانے" یا "مس" کرنے سے مراد لغت کے اعتبار سے تو محض چھونا ہے، لیکن یہاں یہ لفظ کنایۃً "مباشرت" کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لحاظ سے ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر شوہر نے مباشرت نہ کی ہو تو خواہ وہ عورت کے پاس تنہائی میں رہا ہو، بلکہ اسے ہاتھ بھی لگایا ہو تب بھی طلاق دینے کی صورت میں عدت لازم نہ آئے۔ لیکن فقہا نے بربنائے احتیاط یہ حکم لگایا ہے کہ اگر خلوت صحیحہ ہو جائے (یعنی جس میں مباشرت ممکن ہو) تو اس کے بعد طلاق دینے کی صورت میں عدت لازم آئے گی اور سقوطِ عدت صرف اُس حالت میں ہو گا جبکہ خلوت سے پہلے طلاق دے دی گئی ہو۔

۴- طلاق قبلِ خلوت کی صورت میں عدت ساقط ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اس صورت میں مرد کا حق رجوع باقی نہیں رہتا اور عورت کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ طلاق کے فوراً بعد جس سے چاہے نکاح کر لے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ حکم صرف طلاق قبلِ خلوت کا ہے۔ اگر خلوت سے پہلے عورت کا شوہر مر جائے تو اس صورت میں عدتِ وفات ساقط نہیں ہوتی بلکہ عورت کو وہی چار مہینے دس دن کی عدت گزارنی ہوتی ہے جو منکوحۂ مدخولہ کے لیے واجب ہے۔ (عدت سے مراد وہ مدت ہے جس کے گزرنے سے پہلے عورت کے لیے دوسرا نکاح جائز نہ ہو)

۵ - مَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ (تمہارے لیے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے) کے الفاظ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ عدت عورت پر مرد کا حق ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ صرف مرد ہی کا حق ہے۔ دراصل اس میں دو حق اور بھی شامل ہیں۔ ایک حقِ اولاد۔ دوسرے حق اللہ یا حق الشرع۔ مرد کا حق وہ اس بنا پر ہے کہ اس دوران میں اُس کو رجوع کر لینے کا حق ہے۔ نیز اس بنا پر کہ اس کی اولاد کے نسب کا ثبوت اس بات پر منحصر ہے کہ عدت کے زمانہ میں عورت کا حاملہ ہونا یا نہ ہونا ظاہر ہو جائے۔ اولاد کا حق اس میں شامل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اپنے باپ سے اس کے نسب کا ثابت ہونا اس کے قانونی حقوق قائم ہونے کے لیے ضروری ہے اور اس کے اخلاقی مرتبے کا انحصار بھی اس امر پر ہے کہ اس کا نسب مشتبہ نہ ہو۔ پھر اس میں حق اللہ (یا حق الشرع) اس لیے شامل ہو جاتا ہے کہ اگر لوگوں کو اپنے اور اپنی اولاد کے حقوق کی پروا نہ بھی ہو تو خدا کی شریعت ان حقوق کی حفاظت ضروری سمجھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو یہ پروانہ بھی لکھ کر دے دے کہ میرے مرنے کے بعد یا مجھ سے طلاق لے لینے کے بعد تیرے اُوپر میری طرف سے کوئی عدت واجب نہ ہو گی تب بھی شریعت کسی حال میں اس کو ساقط نہ کرے گی۔

۶ - فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (ان کو کچھ مال دو اور بھلے طریقے سے رخصت کر دو) اس حکم کا منشا دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقے پر پُورا کرنا ہو گا۔ اگر نکاح کے وقت مہر مقرر کیا گیا تھا اور پھر خلوت سے پہلے طلاق دے دی گئی تو اس صورت میں نصف مہر دینا واجب ہو گا جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۷ میں ارشاد ہُوا ہے۔ اس واجب سے زائد کچھ دینا لازم نہیں ہے مگر مستحب ہے، مثلاً یہ بات پسندیدہ ہے کہ نصف مہر دینے کے ساتھ مرد وہ جوڑا بھی عورت کے پاس ہی رہنے دے جو دلہن بننے کے لیے اسے بھیجا گیا تھا۔ یا اور کچھ سامان اگر شادی کے موقع پر اسے دیا گیا تھا تو وہ واپس نہ لے۔ لیکن اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو اس صورت میں عورت کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کرنا واجب ہے، اور یہ "کچھ نہ کچھ"

آدمی کی حیثیت اور مقدرت کے مطابق ہونا چاہیئے، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۶ میں فرمایا گیا ہے۔ علماء کا ایک گروہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ متعۂ طلاق دینا بہرحال واجب ہے خواہ مہر مقرر کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔

۷۔ بھلے طریقے سے رخصت کرنے کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ عورت کو کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کیا جائے بلکہ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی قسم کا فضیحتی کے بغیر شریفانہ طریقے سے علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ ایک آدمی کو اگر عورت پسند نہیں آئی ہے یا کوئی اور وجہ شکایت پیدا ہوئی ہے جس کی بنا پر وہ اس عورت کو نہیں رکھنا چاہتا تو بھلے آدمیوں کی طرح اسے طلاق دے اور رخصت کر دے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس کے عیوب لوگوں کے سامنے بیان کرے اور اپنی شکایتوں کے دفتر کھولے تاکہ کوئی دوسرا بھی اس عورت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ قرآن کے اس ارشاد سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ طلاق کے نفاذ کو کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ معلق کرنا خدائی تشریع کی حکمت و مصلحت کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ اس صورت میں "بھلے طریقے سے رخصت کرنے" کا کوئی امکان نہیں رہتا، بلکہ مرد نہ بھی چاہے تو قضیحتی اور بدنامی و رسوائی ہو کر رہتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں اس امر کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے کہ مرد کا اختیارِ طلاق کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ مشروط ہو۔ آیت بالکل صراحت کے ساتھ ناکح کو طلاق کا اختیار دے رہی ہے اور اسی پر یہ ذمہ داری ڈال رہی ہے کہ اگر وہ ہاتھ لگانے سے پہلے ہی عورت کو چھوڑنا چاہے تو لازماً نصف مہر دے کر یا اپنی حیثیت کے مطابق کچھ مال دے کر چھوڑے۔ اس سے آیت کا مقصود صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کو کھیل بننے سے روکنے کے لیے مرد پر مالی ذمہ داری کا ایک بوجھ ڈال دیا جائے تاکہ وہ خود ہی اپنے اختیارِ طلاق کو سوچ سمجھ کر استعمال کرے اور دو خاندانوں کے اندرونی معاملے میں کسی بیرونی مداخلت کی نوبت نہ آنے پائے، بلکہ شوہر سرے سے کسی کو یہ بتانے پر مجبور ہی نہ ہو کہ وہ بیوی کو کیوں چھوڑ رہا ہے۔

۸- ابن عباس، سعید بن المسیب، حسن بصری، علی بن الحسین (زین العابدین)، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے آیت کے الفاظ "جب تم نکاح کرو، پھر طلاق دے دو" سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق اُسی صورت میں واقع ہوتی ہے جبکہ اس سے پہلے نکاح ہو چکا ہو۔ نکاح سے پہلے طلاق بے اثر ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص یوں کہے کہ "اگر میں فلاں عورت سے، یا فلاں قبیلے یا قوم کی عورت سے، یا کسی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے"، تو یہ قول لغو و بے معنی ہے، اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہو سکتی۔ اس خیال کی تائید میں یہ احادیث بھی پیش کی جاتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: لا طلاق لابن آدم فی مالا یملک، "ابن آدم جس چیز کا مالک نہیں ہے اُس کے بارے میں طلاق کا اختیار استعمال کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا" (احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ) اور لا طلاق قبل النکاح، "نکاح سے پہلے کوئی طلاق نہیں" (ابن ماجہ)۔ مگر فقہا کی ایک بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ اس آیت اور ان احادیث کا اطلاق صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ کوئی شخص ایک غیر عورت کو جو اس کے نکاح میں نہ ہو یوں کہے کہ "تجھ پر طلاق ہے" یا "میں نے تجھے طلاق دی"۔ یہ قول بلاشبہ لغو ہے جس پر کوئی قانونی نتیجہ مترتب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر وہ یوں کہے کہ "اگر میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھ پر طلاق ہے"، تو یہ نکاح سے پہلے طلاق دینا نہیں ہے بلکہ دراصل وہ شخص اس امر کا فیصلہ اور اعلان کرتا ہے کہ جب وہ عورت اس کے نکاح میں آئے گی تو اس پر طلاق وارد ہو گی۔ یہ قول لغو و بے اثر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ جب بھی وہ عورت اس کے نکاح میں آئے گی اُسی وقت اُس پر طلاق پڑ جائے گی۔ یہ مسلک جن فقہاء کا ہے ان کے درمیان پھر اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ اس نوعیت کے ایقاع طلاق کی وسعت کس حد تک ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام محمد اور امام زُفر کہتے ہیں کہ خواہ کوئی شخص عورت یا قوم یا قبیلے کی تخصیص کرے یا مثال کے طور پر عام بات اس طرح کہے، "جس عورت سے بھی میں نکاح کروں اس پر طلاق ہے"، دونوں صورتوں میں طلاق واقع ہو جائے گی۔ ابوبکر جصاص نے یہی رائے حضرت عمرؓ،

اے نبی، ہم نے تمہارے لیے حلال کر دیں تمہاری وہ بیویاں جن کے مہر تم نے ادا کیے ہیں، ۸۶
اور وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے تمہاری ملکیت میں آئیں اور تمہاری وہ چچا زاد،
اور پھوپھی زاد اور ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں جنھوں نے تمہارے ساتھ ہجرت کی ہے، اور وہ مومن

عبداللہ بن مسعود، ابراہیم النخعی، مجاہد اور عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ سے بھی نقل کی ہے۔

سفیان ثوری اور عثمان البتی کہتے ہیں کہ طلاق صرف اُسی صورت میں پڑے گی جب کہ کہنے والا یوں کہے کہ "اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے"۔

حسن بن صالح، لیث بن سعد اور عامر الشعبی کہتے ہیں کہ اس طرح کی طلاق عمومیت کے ساتھ بھی پڑ سکتی ہے بشرطیکہ اس میں کسی نوع کی تخصیص ہو۔ مثلاً آدمی نے یُوں کہا ہو کہ "اگر میں فلاں خاندان، یا فلاں قبیلے، یا فلاں شہر یا ملک یا قوم کی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے"۔

ابن ابی لیلیٰ اور امام مالک اُوپر کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے مزید شرط یہ لگاتے ہیں کہ اس میں مدت کا بھی تعین ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر آدمی نے یوں کہا ہو کہ "اگر میں اس سال یا آئندہ دس سال کے اندر فلاں عورت یا فلاں گروہ کی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے" تب یہ طلاق واقع ہوگی ورنہ نہیں۔ بلکہ امام مالک اس پر اتنا اضافہ اور کرتے ہیں کہ اگر یہ مدت اتنی طویل ہو جس میں اس شخص کا زندہ رہنا متوقع نہ ہو تو اس کا قول بے اثر رہے گا۔

۸۶؎ یہ دراصل جواب ہے اُن لوگوں کے اعتراض کا جو کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دوسرے لوگوں کے لیے تو بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع قرار دیتے ہیں، مگر انھوں نے خود یہ پانچویں بیوی کیسے کر لی۔ اس اعتراض کی بنیاد یہ تھی کہ حضرت زینبؓ سے نکاح کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیویاں موجود تھیں۔ ایک، حضرت سَودہؓ جن سے ۳؁ قبلِ ہجرت میں آپؐ نے نکاح کیا تھا۔ دوسری، حضرت عائشہؓ جن سے نکاح تو ۳؁ قبلِ ہجرت میں ہو چکا تھا مگر ان کی رخصتی شوال ۱؁ھ میں ہوئی تھی۔ تیسری، حضرت حفصہؓ جن سے شعبان ۳؁ھ میں آپؐ کا نکاح ہوا۔ اور چوتھی حضرت ام سلمہؓ جنہیں حضورؐ نے شوال ۴؁ھ میں زوجیت کا شرف عطا فرمایا۔ اس طرح حضرت زینبؓ آپؐ کی پانچویں بیوی

عورت جس نے اپنے آپ کو نبی کے لیے ہبہ کیا ہو اگر نبی اسے نکاح میں لینا چاہے۸۵۔ یہ رعایت

تھیں۔ اس پر کفار و منافقین کے اعتراض کا جواب اللہ تعالٰی یہ دے رہا ہے کہ اے نبیؐ، تمہاری یہ پانچوں بیویاں جنہیں مہر دے کر تم اپنے نکاح میں لائے ہو، ہم نے تمہارے لیے حلال کی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے لیے چار کی قید لگانے والے بھی ہم ہی ہیں اور اپنے نبی کو اس قید سے مستثنیٰ کرنے والے بھی ہم خود ہیں۔ اگر وہ قید لگانے کے ہم مجاز تھے تو آخر اس استثناء کے مجاز ہم کیوں نہیں ہیں۔

اس جواب کے بارے میں یہ بات پھر ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے کہ اس سے مقصود کفار و منافقین کو مطمئن کرنا نہیں تھا بلکہ اُن مسلمانوں کو مطمئن کرنا تھا جن کے دلوں میں مخالفینِ اسلام وسوسے ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں چونکہ یقین تھا کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اللہ تعالٰی کے اپنے الفاظ میں نازل ہوا ہے، اس لیے قرآن کی ایک محکم آیت کے ذریعہ سے اللہ تعالٰی نے اعلان فرمایا کہ نبی نے چار بیویوں کے عام قانون سے اپنے آپ کو خود مستثنیٰ نہیں کر لیا ہے بلکہ یہ استثناء کا فیصلہ ہمارا کیا ہوا ہے۔

۸۵ پانچویں بیوی کو حضورؐ کے لیے حلال کرنے کے علاوہ اللہ تعالٰی نے اس آیت میں حضورؐ کو چند مزید اقسام کی عورتوں سے بھی نکاح کی اجازت عطا فرمائی:

۱۔ وہ عورتیں جو اللہ کی عطا کردہ لونڈیوں میں سے آپؐ کی ملکیت میں آئیں۔ اس اجازت کے مطابق حضورؐ نے غزوۂ قریظہ کے سبایا میں سے حضرت ریحانہؓ، غزوۂ بنی المصطلق کے سبایا میں سے حضرت جُوَیریہؓ، غزوۂ خیبر کے سبایا میں سے حضرت صفیہؓ اور مُقوقِس مصر کی بھیجی ہوئی حضرت ماریہؓ قبطیہ کو اپنے لیے مخصوص فرمایا۔ ان میں سے مقدم الذکر تین کو آپؐ نے آزاد کر کے ان سے نکاح کیا تھا، لیکن حضرت ماریہؓ سے بربنائے ملک یمین تمتع فرمایا، ان کے بارے میں یہ ثابت نہیں ہے کہ آپؐ نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کیا ہو۔

۲۔ آپؐ کی چچازاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد اور خالہ زاد بہنوں میں سے وہ خواتین جنہوں نے ہجرت

خالصۃً تمہارے لیے ہے، دوسرے مومنوں کے لیے نہیں ہے[۵۶]۔ ہم کو معلوم ہے کہ عام مومنوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے بارے میں ہم نے کیا حدود عائد کیے ہیں۔ (تمہیں ان حدود سے ہم نے اس لیے

میں آپؐ کا ساتھ دیا ہو۔ آیت میں آپؐ کے "ساتھ" ہجرت کرنے کا جو ذکر آیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہجرت کے سفر میں آپؐ کے ساتھ رہی ہوں، بلکہ یہ تھا کہ وہ بھی اسلام کی خاطر راہِ خدا میں ہجرت کر چکی ہوں۔ حضورؐ کو اختیار دیا گیا کہ ان رشتہ دار مہاجر خواتین میں سے بھی آپؐ جس سے چاہیں نکاح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس اجازت کے مطابق آپؐ نے سنہ ۷ھ میں حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح فرمایا۔ (ضمناً اس آیت میں یہ صراحت بھی ہے کہ چچا، ماموں، پھوپھی اور خالہ کی بیٹیاں ایک مسلمان کے لیے حلال ہیں۔ اس معاملہ میں اسلامی شریعت عیسائی اور یہودی دونوں مذہبوں سے مختلف ہے۔ عیسائیوں کے ہاں کسی ایسی عورت سے نکاح نہیں ہو سکتا جس سے سات پشت تک مرد کا نسب ملتا ہو۔ اور یہودیوں کے ہاں سگی بھانجی اور بھتیجی تک سے نکاح جائز ہے)۔

۳۔ وہ مومن عورت جو اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہبہ کرے، یعنی بلا مہر اپنے آپ کو حضورؐ کے نکاح میں دینے کے لیے تیار ہو اور حضورؐ اسے قبول کرنا پسند فرمائیں۔ اس اجازت کی بنا پر آپؐ نے شوال سنہ ۷ھ میں حضرت میمونہؓ کو اپنی زوجیت میں لیا لیکن آپؐ نے یہ پسند نہ کیا کہ مہر کے بغیر اُن کے ہبہ سے فائدہ اٹھائیں۔ اس لیے آپؐ نے ان کی کسی خواہش اور مطالبہ کے بغیر ان کو مہر عطا فرمایا۔ بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے نکاح میں کوئی موہوبہ بیوی نہ تھیں۔ مگر اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ آپؐ نے ہبہ کرنے والی بیوی کو بھی مہر دیے بغیر نہ رکھا۔

۵۵ اس فقرے کا تعلق اگر صرف قریب کے فقرے سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ دوسرے کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی عورت اپنے آپ کو اس کے لیے ہبہ کرے اور وہ بلا مہر اس سے نکاح کر لے۔ اور اگر اس کا تعلق اُوپر کی پوری عبارت سے مانا جائے تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ چار سے زیادہ نکاح کرنے کی رعایت بھی صرف حضورؐ کے لیے ہے، عام مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔ اس آیت سے

مستثنیٰ کیا ہے) تاکہ تمہارے اُوپر کوئی تنگی نہ رہے[۸۹]، اور اللہ غفور و رحیم ہے۔ تم کو اختیار دیا جاتا ہے کہ اپنی بیویوں میں سے جس کو چاہو اپنے سے الگ رکھو، جسے چاہو اپنے ساتھ رکھو اور جسے چاہو الگ رکھنے کے بعد اپنے پاس بُلا لو۔ اس معاملہ میں تم پر کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس طرح زیادہ متوقع ہے کہ اُن کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں گی اور وہ رنجیدہ نہ ہوں گی، اور جو کچھ بھی تم ان کو دوگے اس پر وہ

یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کچھ احکام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہیں جن میں امت کے دوسرے لوگ آپؐ کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔ قرآن و سنت کے تتبع سے ایسے متعدد احکام کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً حضورؐ کے لیے نماز تہجد فرض تھی اور باقی تمام امت کے لیے نفل ہے۔ آپؐ کے لیے اور آپؐ کے خاندان والوں کے لیے صدقہ لینا حرام ہے، اور کسی کے لیے بھی وہ حرام نہیں۔ آپؐ کی میراث تقسیم نہ ہوسکتی تھی، باقی سب کی میراث کے لیے وہ احکام ہیں جو سورۂ نساء میں بیان ہوئے ہیں۔ آپؐ کے لیے چار سے زائد بیویاں حلال کی گئیں، بیویوں کے درمیان عدل آپؐ پر واجب نہیں کیا گیا، اپنے آپ کو ہبہ کرنے والی عورت سے بلا مہر نکاح کر لینے کی آپؐ کو اجازت دی گئی، اور آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی بیویاں تمام امت پر حرام کر دی گئیں۔ ان میں سے کوئی خصوصیت بھی ایسی نہیں ہے جو حضورؐ کے علاوہ کسی مسلمان کو حاصل ہو۔ مفسرین نے آپؐ کی ایک خصوصیت یہ بھی بیان کی ہے کہ آپؐ کے لیے کتابیہ عورت سے نکاح ممنوع تھا، حالانکہ باقی امت کے لیے وہ حلال ہے۔

۸۹ یہ وہ مصلحت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عام قاعدے سے مستثنیٰ فرمایا۔ "تنگی نہ رہے" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نعوذ باللہ آپؐ کی خواہشاتِ نفسانی بہت بڑھی ہوئی تھیں اس لیے آپؐ کو بہت سی بیویاں کرنے کی اجازت دے دی گئی تاکہ آپؐ صرف چار بیویوں تک محدود رہنے میں تنگی محسوس نہ فرمائیں۔ اس فقرے کا یہ مطلب صرف وہی شخص لے سکتا ہے جو تعصب میں اندھا ہو کر اس بات کو بھول جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۵ سال کی عمر میں ایک ایسی خاتون سے شادی کی تھی جن کی عمر اُس وقت ۴۰ سال تھی، اور پورے ۲۵ برس تک آپؐ ان کے ساتھ نہایت خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کرتے رہے۔ پھر جب اُن کا انتقال ہوگیا تو آپؐ نے ایک اور سِن رسیدہ خاتون حضرت سودہؓ سے نکاح

گیا اور پورے چار سال تک تنہا وہی آپؐ کی بیوی رہیں۔ اب آخر کون صاحبِ عقل اور ایمان دار آدمی یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ ۵۳ سال کی عمر سے گزر جانے کے بعد یکایک حضورؐ کی خواہشات نفسانی بڑھتی چلی گئیں اور آپؐ کو زیادہ سے زیادہ بیویوں کی ضرورت پیش آنے لگی۔ دراصل "تنگی نہ رہنے" کا مطلب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ایک طرف تو اُس کارِ عظیم کو نگاہ میں رکھے جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اُوپر ڈالی تھی اور دوسری طرف اُن حالات کو سمجھے جن میں یہ کارِ عظیم انجام دینے کے لیے آپؐ کو مامور کیا گیا تھا۔ تعصب سے ذہن کو پاک کر کے جو شخص بھی اِن دونوں حقیقتوں کو سمجھ لے گا وہ بخوبی جان لے گا کہ بیویوں کے معاملے میں آپؐ کو کھلی اجازت دینا کیوں ضروری تھا، اور چار کی قید میں آپؐ کے لیے کیا "تنگی" تھی۔

حضورؐ کے سپرد جو کام کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ آپؐ ایک اُن گھڑ قوم کو جو اسلامی نقطۂ نظر ہی سے نہیں بلکہ عام تہذیب و تمدن کے نقطۂ نظر سے بھی سخت ناتراشیدہ تھی، ہر شعبۂ زندگی میں تعلیم و تربیت دے کر ایک اعلیٰ درجہ کی مہذب، شائستہ اور پاکیزہ قوم بنائیں۔ اس غرض کے لیے صرف مردوں کو تربیت دینا کافی نہ تھا، بلکہ عورتوں کی تربیت بھی اتنی ہی ضروری تھی۔ مگر جو اُصولِ تمدن و تہذیب سکھانے کے لیے آپؐ مامور کیے گئے تھے اُن کی رُو سے مردوں اور عورتوں کا آزادانہ اختلاط ممنوع تھا اور اس قاعدے کو توڑے بغیر آپؐ کے لیے عورتوں کو براہِ راست خود تربیت دینا ممکن نہ تھا۔ اس بنا پر عورتوں میں کام کرنے کی صرف یہی ایک صورت آپؐ کے لیے ممکن تھی کہ مختلف عمروں اور ذہنی صلاحیتوں کی متعدد خواتین سے آپؐ نکاح کریں، اُن کو براہِ راست خود تعلیم و تربیت دے کر اپنی مدد کے لیے تیار کریں، اور پھر اُن سے شہری اور بدوی، جوان اور ادھیڑ اور بوڑھی، ہر قسم کی عورتوں کو دین سکھانے اور اخلاق و تہذیب کے نئے اُصول سمجھانے کا کام لیں۔

اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد یہ خدمت بھی کی گئی تھی کہ پُرانے جاہلی نظامِ زندگی کو ختم کر کے اس کی جگہ اسلامی نظامِ زندگی عملاً قائم کر دیں۔ اس خدمت کی انجام دہی میں جاہلی نظام کے علمبرداروں سے جنگ ناگزیر تھی۔ اور یہ کشمکش ایک ایسے ملک میں پیش آ رہی تھی جہاں قبائلی طرزِ زندگی اپنی مخصوص روایات کے ساتھ رائج تھا۔ اِن حالات میں دوسری تدابیر کے ساتھ آپؐ کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ آپؐ مختلف

خاندانوں میں نکاح کر کے بہت سی دوستیوں کو پختہ اور بہت سی عداوتوں کو ختم کر دیں۔ چنانچہ جن خواتین سے آپؐ نے شادیاں کیں ان کے ذاتی اوصاف کے علاوہ ان کے انتخاب میں یہ مصلحت بھی کم و بیش شامل تھی۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کے ساتھ نکاح کر کے آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ساتھ اپنے تعلقات کو اور زیادہ گہرا اور مستحکم کر لیا۔ حضرت ام سلمہؓ اُس خاندان کی بیٹی تھیں جس سے ابوجہل اور خالد بن ولیدؓ کا تعلق تھا۔ اور حضرت ام حبیبہؓ ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔ ان شادیوں نے بہت بڑی حد تک ان خاندانوں کی دشمنی کا زور توڑ دیا، بلکہ ام حبیبہؓ کے ساتھ حضورؐ کا نکاح ہونے کے بعد تو ابوسفیان پھر کبھی حضورؐ کے مقابلہ پر نہ آیا۔ حضرت صفیہؓ، جویریہؓ اور ریحانہؓ یہودی خاندانوں سے تھیں۔ انہیں آزاد کر کے جب حضورؐ نے ان سے نکاح کیے تو آپؐ کے خلاف یہودیوں کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ کیونکہ اس زمانے کی عربی روایات کے مطابق جس شخص سے کسی قبیلے کی بیٹی بیاہی جاتی تھی وہ صرف لڑکی کے خاندان ہی کا نہیں بلکہ پورے قبیلے کا داماد سمجھا جاتا تھا اور داماد سے لڑنا بڑے عار کی بات تھی۔

معاشرے کی عملی اصلاح اور اس کی جاہلانہ رسوم کو توڑنا بھی آپؐ کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔ چنانچہ ایک نکاح آپؐ کو اس مقصد کے لیے بھی کرنا پڑا، جیسا کہ اسی سورۂ احزاب میں مفصل بیان ہو چکا ہے۔

یہ مصلحتیں اس بات کی مقتضی تھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نکاح کے معاملے میں کوئی تنگی باقی نہ رکھی جائے۔ تاکہ جو کارِ عظیم آپؐ کے سپرد کیا گیا تھا اُس کی ضروریات کے لحاظ سے آپؐ جتنے نکاح کرنا چاہیں کریں۔

اِس بیان سے اُن لوگوں کے خیال کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے جو سمجھتے ہیں کہ تعددِ ازواج صرف چند خاص شخصی ضرورتوں کی خاطر ہی جائز ہے اور اُن کے ماسوا کوئی غرض ایسی نہیں ہو سکتی جس کے لیے یہ جائز ہو۔ ظاہر بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ایک سے زائد نکاح کیے ان کی وجہ یہ نہ تھی کہ بیوی بیمار تھی، یا بانجھ تھی، یا اولادِ نرینہ نہ تھی، یا کچھ یتیموں کی پرورش کا مسئلہ درپیش تھا۔ ان محدود شخصی ضروریات کے بغیر آپؐ نے تمام نکاح یا تو تبلیغی و تعلیمی ضروریات کے لیے کیے، یا اصلاحِ معاشرہ کے لیے، یا سیاسی و اجتماعی مقاصد کے لیے۔ سوال یہ ہے کہ جب اللہ نے خود تعددِ ازواج کو اُن چند گنی چُنی مخصوص اغراض تک جن کا آج نام لیا جا رہا ہے، محدود نہیں رکھا، اور اللہ کے رسول نے اُن کے سوا بہت سے دُوسرے مقاصد

سب راضی رہیں گی۔[۹] اللہ جانتا ہے جو کچھ تم لوگوں کے دلوں میں ہے، اور اللہ

کے لیے متعدد نکاح کیے، تو کوئی دوسرا شخص کیا حق رکھتا ہے کہ قانون میں اپنی طرف سے چند قیود تجویز کرے اور اُوپر سے دعوٰی یہ کرے کہ یہ حد بندیاں وہ شریعت کے مطابق کر رہا ہے۔ در اصل ان ساری حد بندیوں کی جڑ یہ مغربی تخیل ہے کہ تعدد ازواج بجائے خود ایک برائی ہے۔ اسی تخیل کی بنا پر یہ نظریہ پیدا ہوا ہے کہ یہ فعل حرام اگر کبھی حلال ہو بھی سکتا ہے تو صرف شدید ناگزیر ضروریات کے لیے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس درآمد شدہ تخیل پر اسلام کا جعلی ٹھپہ لگانے کی چاہے کتنی ہی کوشش کی جائے، قرآن و سنت اور پوری امتِ مسلمہ کا لٹریچر اس سے قطعاً ناآشنا ہے۔

نـ۹ اس آیت سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خانگی زندگی کی الجھنوں سے نجات دلانا تھا تاکہ آپ پورے سکون کے ساتھ اپنا کام کر سکیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں حضورؐ کو پورے اختیارات دے دیے کہ ازواج مطہرات میں سے جس کے ساتھ جو برتاؤ چاہیں کریں تو اس بات کا کوئی امکان نہ رہا کہ یہ مومن خواتین آپؐ کو کسی طرح پریشان کرتیں یا آپس میں مسابقت اور رقابت کے جھگڑے پیدا کر کے آپؐ کے لیے الجھنیں پیدا کرتیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے یہ اختیار پا لینے کے بعد بھی حضورؐ نے تمام ازواج کے درمیان پورا پورا عدل فرمایا، کسی کو کسی پر ترجیح نہ دی، اور باقاعدہ باری مقرر کر کے آپؐ سب کے ہاں تشریف لے جاتے رہے۔ محدثین میں سے صرف ابو رزین یہ بیان کرتے ہیں کہ حضورؐ نے صرف چار بیویوں (حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت زینبؓ اور حضرت ام سلمہؓ) کو باریوں کی تقسیم میں شامل کیا تھا اور باقی ازواج کے لیے کوئی باری مقرر نہ کی تھی۔ لیکن دوسرے تمام محدثین و مفسرین اس کی تردید کرتے ہیں اور نہایت قوی روایات سے اس امر کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اس اختیار کے بعد بھی حضورؐ تمام ازواج کے ہاں باری باری سے جاتے تھے اور سب سے یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ بخاری، مسلم، نسائی اور ابو داؤد وغیرہم حضرت عائشہؓ کا قول نقل کرتے ہیں کہ "اس آیت کے نزول کے بعد بھی حضورؐ کا طریقہ یہی رہا کہ آپؐ ہم میں سے کسی بیوی کی باری کے دن دوسری بیوی کے ہاں جاتے تو اس سے اجازت لے کر جاتے تھے۔" ابوبکر جصاص عُروہ بن زبیر کی روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ان سے

فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باریوں کی تقسیم میں ہم میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہ دیتے تھے۔ اگرچہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ آپؐ کسی روز اپنی سب بیویوں کے ہاں نہ جاتے ہوں، مگر جس بیوی کی باری کا دن ہوتا تھا اس کے سوا کسی دوسری بیوی کو چھوتے تک نہ تھے"۔ اور یہ روایت بھی حضرت عائشہؓ ہی کی ہے کہ جب حضورؐ اپنی آخری بیماری میں مبتلا ہوئے اور نقل و حرکت آپؐ کے لیے مشکل ہوگئی تو آپؐ نے سب بیویوں سے اجازت طلب کی کہ مجھے عائشہؓ کے ہاں رہنے دو، اور جب سب نے اجازت دے دی تب آپؐ نے آخری زمانہ حضرت عائشہؓ کے ہاں گزارا۔ ابن ابی حاتم امام زُہری کا قول نقل کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی بیوی کو باری سے محروم کرنا ثابت نہیں ہے۔ اس سے صرف حضرت سودہؓ مستثنیٰ ہیں جنھوں نے خود اپنی باری بخوشی حضرت عائشہؓ کو بخش دی تھی، کیونکہ وہ بہت سن رسیدہ ہو چکی تھیں۔

اس مقام پر کسی کے دل میں یہ شبہ نہ رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے معاذ اللہ اس آیت میں اپنے نبیؐ کے ساتھ کوئی بے جا رعایت کی تھی اور ازواجِ مطہرات کے ساتھ حق تلفی کا معاملہ فرمایا تھا۔ دراصل جن عظیم مصالح کی خاطر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بیویوں کی تعداد کے معاملہ میں عام قاعدے سے مستثنیٰ کیا گیا تھا انہی مصالح کا تقاضا یہ بھی تھا کہ آپؐ کو خانگی زندگی کا سکون بہم پہنچایا جائے اور اُن اسباب کا سدباب کیا جائے جو آپؐ کے لیے پریشان خاطری کے موجب ہو سکتے ہوں۔ ازواجِ مطہرات کے لیے یہ ایک بہت بڑا شرف تھا کہ انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسی بزرگ ترین ہستی کی زوجیت حاصل ہوئی اور اس کی بدولت اُن کو یہ موقع نصیب ہوا کہ دعوت و اصلاح کے اُس عظیم الشان کام میں آپؐ کی رفیقِ کار بنیں جو رہتی دنیا تک انسانیت کی فلاح کا ذریعہ بننے والا تھا۔ اس مقصد کے لیے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیر معمولی ایثار و قربانی سے کام لے رہے تھے اور تمام صحابہ کرامؓ اپنی حدِ استطاعت تک قربانیاں کر رہے تھے اسی طرح ازواجِ مطہرات کا بھی یہ فرض تھا کہ ایثار سے کام لیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کو تمام ازواجِ رسولؐ نے بخوشی قبول کیا۔

علیم و حلیم ہے[۹۱]۔ اس کے بعد تمہارے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں، اور نہ اس کی اجازت ہے کہ ان کی جگہ اور بیویاں لے آؤ خواہ ان کا حسن تمہیں کتنا ہی پسند ہو[۹۲]، البتہ لونڈیوں کی تمہیں اجازت ہے[۹۳]۔ اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔ ع۶

[۹۱] یہ تنبیہ ہے ازواجِ مطہرات کے لیے بھی اور دوسرے تمام لوگوں کے لیے بھی۔ ازواجِ مطہرات کے لیے تنبیہ اس بات کی ہے کہ اللہ کا یہ حکم آجانے کے بعد اگر وہ دل میں بھی کبیدہ خاطر ہوں گی تو گرفت سے نہ بچ سکیں گی۔ اور دوسرے لوگوں کے لیے اس میں یہ تنبیہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی کے متعلق کسی طرح کی بدگمانی بھی اگر انہوں نے اپنے دل میں رکھی یا فکر و خیال کے کسی گوشے میں بھی کوئی وسوسہ پالتے رہے تو اللہ سے ان کی یہ چوری چھپی نہ رہ جائے گی۔ اس کے ساتھ اللہ کی صفت حلم کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ آدمی کو یہ معلوم ہو جائے کہ نبیؐ کی شان میں گستاخی کا تخیل بھی اگرچہ سخت سزا کا مستوجب ہے، لیکن جس کے دل میں کبھی ایسا کوئی وسوسہ آیا ہو وہ اگر اسے نکال دے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں معافی کی امید ہے۔

[۹۲] اس ارشاد کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ جو عورتیں اوپر آیت نمبر ۵۰ میں حضورؐ کے لیے حلال کی گئی ہیں ان کے سوا دوسری کوئی عورت اب آپؐ کے لیے حلال نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جب آپؐ کی ازواجِ مطہرات اس بات کے لیے راضی ہو گئی ہیں کہ تنگی و ترشی میں آپؐ کا ساتھ دیں اور آخرت کے لیے دنیا کو انہوں نے تج دیا ہے، اور اس پر بھی خوش ہیں کہ آپؐ جو برتاؤ بھی ان کے ساتھ چاہیں کریں، تو اب آپؐ کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ ان میں سے کسی کو طلاق دے کر اس کی جگہ کوئی اور بیوی لے آئیں۔

[۹۳] یہ آیت اس امر کی صراحت کر رہی ہے کہ منکوحہ بیویوں کے علاوہ مملوکہ عورتوں سے بھی تمتع کی اجازت ہے اور ان کے لیے تعداد کی کوئی قید نہیں ہے۔ اسی مضمون کی تصریح سورۂ نساء آیت ۳، سورۂ مومنون آیت ۶، اور سورۂ معارج آیت ۳۰ میں بھی کی گئی ہے۔ ان تمام آیات میں مملوکہ عورتوں کو منکوحہ ازواج کے بالمقابل ایک الگ صنف کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے

اور پھر ان کے ساتھ ازدواجی تعلق کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ نیز سورہ نساء کی آیت ۳ منکوحہ بیویوں کے لیے چار کی حد مقرر کرتی ہے، مگر یہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے مملوکہ عورتوں کے لیے تعداد کی حد مقرر کی ہے اور نہ دوسری متعلقہ آیات میں ایسی کسی حد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ بلکہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ کے لیے اس کے بعد دوسری عورتوں سے نکاح کرنا، یا موجودہ بیویوں میں سے کسی کو طلاق دے کر دوسری بیوی لانا حلال نہیں ہے، البتہ مملوکہ عورتیں حلال ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مملوکہ عورتوں کے معاملے میں کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا کی شریعت یہ گنجائش مالدار لوگوں کو بے حساب لونڈیاں خرید خرید کر عیاشی کرنے کے لیے دیتی ہے۔ دراصل یہ تو ایک بے جا فائدہ ہے جو نفس پرست لوگوں نے قانون سے اٹھایا ہے۔ قانون بجائے خود انسانوں کی سہولت کے لیے بنایا گیا تھا، اس لیے نہیں بنایا گیا تھا کہ لوگ اس سے یہ فائدہ اٹھائیں۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے شریعت ایک مرد کو چار تک بیویاں کرنے کی اجازت دیتی ہے، اور اسے یہ حق بھی دیتی ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسری بیوی لے آئے۔ یہ قانون انسانی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر بنایا گیا تھا۔ اب اگر کوئی شخص محض عیاشی کی خاطر یہ طریقہ اختیار کرے کہ چار بیویوں کو کچھ مدت رکھ کر طلاق دیتا اور پھر ان کی جگہ بیویوں کی دوسری کھیپ لاتا چلا جائے، تو یہ قانون کی گنجائشوں سے ناروا فائدہ اٹھانا ہے جس کی ذمہ داری خود اسی شخص پر عائد ہوگی نہ کہ خدا کی شریعت پر۔ اسی طرح شریعت نے جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کو، جبکہ ان کی قوم مسلمان قیدیوں سے ان کا تبادلہ کرنے یا فدیہ دے کر ان کو چھڑانے کے لیے تیار نہ ہو؛ لونڈی بنانے کی اجازت دی، اور جن اشخاص کی ملکیت میں وہ حکومت کی طرف سے دے دی جائیں ان کو یہ حق دیا کہ ان عورتوں سے تمتع کریں تاکہ ان کا وجود معاشرے کے لیے اخلاقی فساد کا سبب نہ بن جائے۔ پھر چونکہ لڑائیوں میں گرفتار ہونے والے لوگوں کی کوئی تعداد معین نہیں ہو سکتی تھی اس لیے قانوناً اس امر کی بھی کوئی حد معین نہیں کی جا سکتی تھی کہ ایک شخص بیک وقت کتنے غلام اور کتنی لونڈیاں رکھ سکتا ہے۔ لونڈیوں

اور غلاموں کی خرید و فروخت کو بھی اس بنا پر جائز رکھا گیا کہ اگر کسی لونڈی یا غلام کا نباہ ایک مالک سے نہ ہو سکے تو وہ کسی دوسرے شخص کی ملکیت میں منتقل ہو سکے اور ایک ہی شخص کی دائمی ملکیت مالک و مملوک دونوں کے لیے عذاب نہ بن جائے۔ شریعت نے یہ سارے قواعد انسانی حالات و ضروریات کو ملحوظ رکھ کر سہولت کی خاطر بنائے تھے۔ اگر ان کو مالدار لوگوں نے عیاشی کا ذریعہ بنا لیا تو اس کا الزام انہی پر ہے نہ کہ شریعت پر۔

بقیہ مطبوعات

گلستان حکمت

یہ کتابچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ۶۶۵ حکیمانہ ارشادات و اقوال کا مجموعہ ہے۔ یہ اقوال ایران کے شیعہ عالم احمد علی صاحب نے نہج البلاغہ اور دوسری کتابوں سے جمع کیے ہیں اور ان کا فارسی اور فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے۔ اردو کا ترجمہ و شرح سید مرتضیٰ حسن فاضل کا ہے۔ ترجمہ رواں ہے البتہ صحت اعراب کا پورا اہتمام نہیں کیا گیا۔ تبصرہ نگار کو ہر صفحہ پر ایک دو اعراب کی غلطیاں نظر آئی ہیں۔ یہ کتاب عربی زبان کے طلبہ کے لیے بھی بڑی مفید رہے گی۔ قیمت ایک روپیہ۔

ملنے کا پتہ:۔ رضا کار بک ڈپو۔ بھاٹی گیٹ لاہور

ایمان کی اہمیت

یہ کتاب ہندوستان کے نامور عالم مولانا عبدالحیٔ کی تصنیف ہے اس میں ایمان باللہ، رسولوں پر ایمان، کتب الٰہی پر ایمان، فرشتوں پر ایمان اور آخرت پر ایمان کو نہایت آسان اور قابل فہم انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ کتاب اپنے مضامین اور اسلوب بیان کے لحاظ سے مسلمان اور غیر مسلم سب کے لیے انتہائی مفید ہے۔ مگر تبصرہ نگار کی رائے میں اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کیلئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ مصنف محترم نے "حیات طیبہ" اور "دین کی باتیں" کے بعد "ایمان کی اہمیت" لکھ کر بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ گرد پوش جاذب نظر۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ الحسنات رام پور۔ (یوپی)

باقی دیکھو صفحہ ۵۳

مطلق العنان اقتدار کے تحت مذہبی مناصب

جناب نعیم صدیقی

اولین تجربہ ——— عباسی دورِ عروج میں

(۷)

امام ابو حنیفہ کا قائم کردہ فکری محاذ

امام ابو حنیفہ یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

کفی حزناً ان لا حیاۃٌ ھنیئۃٌ
ولا عملٌ یرضیٰ بہ اللّٰہُ صالحٌ

یہ دو غم دل کے لیے بہت ہیں کہ ایک طرف تو زندگی حسبِ دلخواہ نہ ہو
اور دوسری طرف کوئی ایسا کارِ خیر انجام نہ پا سکے جس سے اللہ راضی ہو

اس شعر کے آئینے میں اس دکھ اور اضطراب کا اندازہ کیجیے جس سے حضرت امام ابو حنیفہ دوچار تھے۔ یعنی زندگی کا نظام ایسا ہو جس پر دل مطمئن نہ ہو، پھر اگر کوئی کارِ خیر بھی انجام نہ پا سکے تو زندگی کیا ہوئی۔ ایک پنجرہ میں رہ کر محض عقوبت اٹھاتے رہنا بے معنی ہے۔ مقصدِ حق کے لیے کوئی اعلیٰ کام کرنا اور اللہ کی رضا کے درپے رہنا ہی اس دُکھ کا توڑ ہے جو زندگی کا نقشہ غلط بن جانے پر اہلِ دل کو اندر ہی اندر کاٹتا ہے۔ کام کی ایک راہ بند کر دی جائے تو اربابِ عشق کی ریت یہ ہے کہ وہ دوسری راہ کھول لیتے ہیں۔ اپنے ہی سینے میں اگر ولولہ مر نہ گیا ہو تو خارجہ کی کوئی جبریت کسی صاحبِ مقصد کے اندرون سے اُمڈتی ہوئی موجِ شوق کو روک نہیں سکتی۔ کام کرنے والوں نے تو خرقۂ تصرف کا نوایجاد پیرایۂ اختیار کر کے خانقاہوں تک میں بیٹھ کر نظامِ فاسد پر الا اللہ کی ضربیں لگائی ہیں۔ (یہ الگ بات ہے کہ یہاں بھی بعض لوگ پیرایہ کو لے کر بیٹھ گئے اور اصل مقصد کو گم کر دیا۔) امام ابو حنیفہ کے عشق کے لیے جب بادیۂ پیمائی کا ایک میدان بند ہوا تو انہوں نے دوسرا ویرانہ پیدا کر لیا۔ دائرۂ سیاست میں قدم سکنا

ممکن نہ رہا تو انہوں نے علم و فکر کی راہ اختیار کر لی۔

امام ابو حنیفہ نے تن تنہا اپنے علم اور اپنے کردار اور اپنے ذاتی مال کے بل پر ایک ایسا عظیم الشان علمی و تحقیقی ادارہ قائم کیا ہے جس کے اثرات بعد کی ساری تاریخ پر چھا گئے۔ ان کی مجلس البرکۃ بیک وقت ایک درسگاہِ قانون بھی تھی، ایک دارالافتاء بھی، ایک ادارۂ تحقیقات (Research Academy) بھی، تدوینِ قانون کا شورائی ایوان بھی، تدریسِ فقہ کے درسی نصاب رکھنے والی کمیٹی بھی، غیر محسوس طور پر ٹھنڈے انقلابی شعور کو بیدار کرنے والا مرکز بھی، اور پھر سب سے بڑھ کر ایسے مردانِ کار کی تربیت گاہ بھی جو آگے چل کر افسرانِ عدلیہ (Judicial Officers) کی حیثیت سے حکومت اور عوام دونوں کے درمیان اپنا موقف سنبھالیں اور دونوں جانب اثر انداز ہو سکیں۔ میں نے جب امام والا مقام کے اس کثیر المقاصد (Multi Purpose) ادارے کی وسعتِ کار کا مطالعہ کیا تو اس اعتراف پر دل مجبور ہو گیا کہ ہماری تاریخ میں اتنی دوربینی سے اتنے بڑے پیمانے پر کم ہی کسی نے سوچا ہوگا اور ایسا طویل المیعاد، عمیق الاثر اور وسیع الظرف منصوبہ شاذ ہی اور کسی نے زیرِ عمل لیا ہوگا۔

علمی تیاری

امام ابو حنیفہ فارسی الاصل تھے۔ نسب نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان ہے[1]۔ کوفہ میں بہ سال سنہ ۸۰ھ پیدائش ہوئی۔ امام کو علمی راہ پر ڈالنے میں شہر کوفہ کے

[1] امام کے نسب کے متعلق بڑی متفرق و متضاد روایات ملتی ہیں۔ ان کے عقیدت مندوں اور ان کے مخالفین نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق سوچا۔ کچھ لوگوں نے انہیں عربی الاصل ثابت کرنا چاہا چنانچہ ملا علی قاری کے بقول ان کا نسب انصار سے ملایا گیا ہے۔ ابو اسحٰق شیرازی نے امام کو بنی شیبان کے سلاطین کا خلف ظاہر کیا ہے۔ بعض لوگوں نے کیقباد اور کیخسرو اور فریدوں سے نسب ملایا ہے۔ ایک روایت کے بموجب آپ ہود علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ دوسری طرف امام کے آباء کا وطن کابل بھی بتایا جاتا ہے اور ہندوستان بھی۔ مورخ ابن خلکان نے ان کے دادا کا نام نعمان کے بجائے زوطی بن ماہ لکھا ہے اور علامہ شبلی کا خیال یہ ہے کہ زوطی جب اسلام لائے

فکر پرور ماحول کا بڑا دخل ہے جو علوم کا گہوارہ تھا۔ عہد فاروقیؓ میں (۱۷ھ) سرکاری حکم سے تعمیر کردہ شہر کوفہ میں حضرت ابن مسعودؓ کو میخانۂ علم کا ساقی بنا کر بٹھایا گیا۔ عہدِ عثمانؓ کے اواخر تک انہوں نے تعلیم دین کا اتنا کام کیا کہ چار ہزار علما و محدثین تیار ہو گئے۔ حضرت علیؓ جب کوفہ تشریف لے گئے تو یہ سماں دیکھ کر پکار اُٹھے "اللہ تعالیٰ ابن مسعود کا بھلا کرے کہ انہوں نے اس بستی کو علم سے بھر دیا" پھر سعید بن جبیر اور امام شعبی اور ابراہیم نخعی کے ہاتھوں ذہنی دنیا میں علم کی خوب ہی چھپن بندیاں ہوئیں۔ کوفہ کا شرف تھا کہ بروایتِ عجلی کم از کم ۱۵۰۰ صحابہ جن میں ۷۰ بدری تھے یہاں آکر مقیم ہوئے۔ اسی گہوارۂ فقہ میں قاضی شریح جیسے جج نے پرورش پائی جنہیں حضرت علیؓ عرب کا سب سے بڑا قاضی کہتے تھے۔ عفان بن مسلم نے احادیث کے جواہر سمیٹنے کے لیے کوفہ کا سفر کیا اور چار ماہ کی مدت میں ایسی ۵۰ ہزار حدیثیں چھانٹ کر جمع کیں جو جمہور کے نزدیک مسلمہ تھیں۔ رجال کی کتابیں گواہ ہیں کہ صدہا راوی کوفہ کے باشندے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام بخاری نے اپنا مجموعہ احادیث مرتب کرنے کے لیے کتنی ہی بار کوفہ کا سفر کیا۔

امام کے ایک قول کے بموجب (اگرچہ اس میں ایک پہلو قابلِ غور بھی ہے) ان کے والد

ہو گئے تو ان کا نام بدل کر نعمان قرار پایا ہو گا۔ زوطی (بہ فتح زا) سے یہ قیاس بھی کیا گیا ہے کہ امام کے آبا پنجاب کے جاٹوں (احادیث میں لفظ رجال الزط کا استعمال ہوا ہے) میں سے تھے۔ ان روایتوں کو جوڑ کر کہا جاتا ہے کہ امام کے خاندان کے بزرگ پنجاب سے کابل، کابل سے خراسان اور پھر وہاں سے کوفہ پہنچے۔ متعصب مخالفین جن کی ترجمانی خطیب بغدادی نے کی ہے امام کے دادا کو موالیوں (بنی تیم کے آزاد کردہ غلام) میں شمار کرتے ہیں اور تو مسلم قرار دیتے ہیں اور المساجی کی مختلف فیہ روایات کو سہارا لیتے ہیں۔ اسی کی تائید علامہ شبلی نے کی۔ امام کے پوتے اسمٰعیل کی زیادہ اہم روایت، دونوں باتوں کی تردید کرتی ہے۔ وہ اپنے خاندان کا فارسی النسل ہونا اور امام کے دادا کا آزاد ہونا قسم کھا کر بیان کرتے ہیں نیز موصوف کے اسلام پر پیدا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ علامہ کوثری نے مشکل الآثار کی ایک روایت سے ثابت کیا ہے کہ آپ کے دادا کو مولیٰ بمعنی حلیف کہا گیا تھا۔

نانبائی تھے[۳] امام نے والد کے ترکہ میں دس ہزار درہم پائے تھے جن سے ریشمی کپڑے کا کاروبار کیا اور اسے پیمانۂ کبیر پر پہنچایا۔ ابتدا میں علم کلام سے دلچسپی تھی[۴] کیونکہ دن رات پوری اسلامی مملکت میں اسی سے گرمئ محفل تھی اور سیاست کے شجرِ ممنوعہ ہونے کی صورت میں شعروادب اور ثقافتی سرگرمیوں کی طرح علم کلام بھی دماغی عیاشی کا بہترین ذریعہ تھا۔ بصرہ کے ساحلی شہر میں چونکہ باہر سے لوگ آکر بحثیں چھیڑتے تھے (جیسے کہ ابوالہذیل العلاف کے ساتھ اسلام پر حملے کرنے والے ایک نووارد یہودی نے بحث کی تھی[۵]) اور علم کلام کا بازار رونق پر تھا اس لیے امام بار بار بصرہ جانے اور عقود الجمان کی روایت کے مطابق ۲۰ سال تک خوارج، اباضیہ، صفریہ اور حشویہ کے خلاف مناظرہ آرائی کرتے اور سال سال بھر متواتر قیام رکھتے۔ مناقب نگاروں کا کہنا ہے کہ اپنے دور میں اس علم کے رئیس بن گئے اور لوگوں کی نگاہوں کا مرکز۔ امام کی نگاہ میں اس علم وفن کی اہمیت اس لیے تھی کہ اس میں دین کی بنیاد (عقاید) سے گفتگو کی جاتی ہے۔ حضرت عمرو بن عبدالعزیزؒ کا دورِ حبیب نظامِ حق کی صبحِ تاباں بن کر سامنے آیا اور کتاب وسنت کے عملی تقاضوں کو اہمیت ملی تو ذوق بدل گئے۔ اس کا اثر یقیناً امام ابوحنیفہ تک بھی پہنچا ہوگا۔ ان کی طبیعت میں موفق مکی کے الفاظ کے مطابق ردِّعمل پیدا ہونے کا پہلا باعث تو یہ احساس تھا کہ کلامیوں کی نہ تو صورتیں اسلاف کی مانند تھیں، نہ ان کے طور طریقے صالحانہ تھے بلکہ دل سخت اور بے حس تھے، کتاب وسنت کے خلاف بھی زبانیں چلاتے اور رنگِ تقویٰ سے خالی تھے۔ (اس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں)۔ اس احساس کے بعد انہوں نے جب مزید غور و تفکر سے کام لیا تو بڑی کام کی بات ذہن سے ابھری۔ فرماتے ہیں:

"ایک مدت علم کلام کی بحثوں میں گزارنے کے بعد میں نے اپنے دل کو ٹٹولا اور سوچنا شروع

---

[۲] مناقب موفق۔ ج ۱، ص ۱۶۲۔

[۳] مقالہ: تدوینِ قانونِ اسلامی۔ از ڈاکٹر حمید اللہ۔ ص ۲۵۔

[۴] تاریخ خطیب بغدادی۔ ج ۳۔ ص ۳۶۶

[۵] مقالہ: تدوین قانون اسلامی۔ از ڈاکٹر حمید اللہ۔ ص ۲۵۔ حقیقت الفقہ۔ ص ۲۲۴

کیا تو دل نے کہا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور تابعین جو گذر گئے ان لوگوں سے کوئی ایسی بات نہیں چھوٹی جسے اب ہم پانا چاہتے ہیں...

..........اس قسم کے مسائل کے متعلق تو انہوں نے جھگڑے کیے نہ مباحثے..

.......البتہ وہ شرائع وقوانین فقہ کے ابواب میں غور و فکر کرتے تھے، ان کے متعلق ہی باتیں کرتے تھے، باہم ان مسائل کے متعلق بیٹھ کر فکر و تامل فرماتے...

........قرنِ اول اس حال میں گذرا جس میں سب سے پہلے اسلام لانے والے صحابہ اور ان کے تابعین گذرے" [1]

اسی ذہنی کیفیت میں تھے کہ ایک واقعہ فوری محرک بن گیا۔ آپ کے شاگرد زفر بن ہذیل نے خود امام سے روایت کیا کہ ایک دن میرے پاس ایک عورت آئی اور پوچھا کہ ایک شخص اپنی منکوحہ (جو باندی ہے) کو سنت کے مطابق طلاق دینا چاہتا ہے، کیسے دے؟ میں کوئی جواب نہ دے سکا اور کہا کہ حماد بن ابی سلیمان کے پاس جاؤ (جن کا حلقۂ درس قریب ہی تھا) اور مسئلہ پوچھ کر مجھے بھی بتاتی جانا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ میں نے دل میں کہا کہ علم کلام کس کام کا ہوا، جوتے اٹھائے اور حماد کی خدمت میں فقہ پڑھنے جا پہنچا۔ [2] پھر دس سال تک یہ سلسلۂ تعلیم جاری رہا۔ تا آنکہ حماد فوت ہو گئے (سالِ وفات ۱۲۰ھ)

امام اعظم کو صحابہ کا دورِ آخر ملا اور ان میں چار کو پایا — یعنی حضرت انس بن مالکؓ اور عبداللہؓ بن ابی اوفیٰ کو کوفہ میں، سہیلؓ بن سعد الساعدی کو مدینہ میں اور ابو الطفیل عامر بن واثلہ کو مکہ میں۔ ان کے علم کا سلسلۂ فیض حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت

---

[1] امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی — از مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم - ص ۱۴ -

[2] ایک قول یہ ہے کہ امام کے سامنے ایک مجلس میں ایلاء کا ذکر آیا۔ انھوں نے کسی ساتھی سے پوچھا یہ ایلاء کیا ہوتا ہے؟ انھوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔ اپنی کوتاہیٔ علم کو محسوس کر کے حماد کے حلقۂ درس میں جا بیٹھے۔

عبد اللہ بن عباس سے ملتا ہے۔ امام کا سلسلۂ شاگردی نبی اکرمؐ تک ذیل کے واسطوں سے پہنچتا ہے۔ حضورؐ سے ابن مسعود الہذلی (ف: ۳۲ھ) نے، اُن سے علقمہ نخعی (ف: ۶۲) نے، اُن سے ابراہیم نخعی (ف: ۹۵ھ) نے، اُن سے حماد بن ابی سلیمان مولی اشعری (ف: ۱۲۰ھ) نے اور اُن سے امام ابو حنیفہ (ف: ۱۵۰ھ) نے فیض حاصل کیا۔[۱] امام جعفر صادق اور اُن کے والد امام محمد باقر کی بھی شاگردی کی۔[۲] حضرت حماد کی نگاہ میں امام ابو حنیفہ اپنی فہانت کی وجہ سے عزیز ترین شاگرد تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی جانشینی کے لیے پہلے تو ان کے صاجزادے اسمٰعیل بن حماد کو سامنے لایا گیا مگر ان کا میدانِ ذوق دوسرا تھا، اس لیے انہیں ترک کر کے حماد کے تلامذہ پر نظر ڈالی گئی تو اکابر نے مشورہ دیا کہ یہ خزّ کا تاجر اچھا علم رکھتا ہے، اگرچہ نوجوان ہے۔ چنانچہ امام کوفہ کے عظیم ترین اُستادِ قانون کی مسند پر بیٹھے۔ اس سے ان کی قابلیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے یہیں سے قانونِ فقہ میں ان کی شہرت کا آغاز ہوا اور وہ ابنِ ہبیرہ کی نگاہ میں آ گئے۔

مگر علم کے منارہ کی چوٹی پر انہیں سفر حجاز (یا ہجرت کہیئے) نے پہنچایا۔ حجاز پہنچ کر انہیں بے شمار علمائے و محدثین کے قریب ہونے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا نادر موقع ملا۔ انہوں نے جن اساتذہ سے فیض پایا ان کی تعداد امام ابو حفص بخاری نے ۴ ہزار بتائی ہے اور یہ سب صحابہ سے ملنے اور تعلیم پانے والے تابعین تھے۔ امام کا عام حلقۂ استفادہ وسیع تر تھا۔[۳] عطاء بن ابی رباح جیسے اُستاد کے حلقہ میں امام کو پایۂ اعزاز حاصل تھا اور خود امام بھی عطاء کی علمی شخصیت کو مرتبۂ اوّل پر رکھتے تھے۔ بہرحال علم کے کئی دریاؤں کو اپنے ساغرِ ذوق میں انڈیل لینے کے بعد حجاز ہی میں

---

[۱] ترجمان السنتہ — از مولانا بدر عالم میرٹھی۔ ص ۲۶۶۔

[۲] تدوینِ قانونِ اسلامی — از ڈاکٹر حمید اللہ۔ ص ۱۸۔

[۳] " " ۔ ص ۱۹۔

[۴] ملاحظہ ہو: معجم البلدان ۔ ج ۲، ص ۲۸۔

خود امام ابوحنیفہ کو اتنا شرف ملا کہ یاسین الزیات لوگوں سے کہتے کہ جا کر ابوحنیفہ کے پاس بیٹھو، حلال و حرام کا ایسا عالم پھر نہ ملے گا اور اس سے محروم رہے تو گویا بہت سارے علم سے محروم رہے۔ [1] بروایت عمارہ بن محمد سماں یہ تھا کہ ابوحنیفہ مسجدِ حرام میں بیٹھے تھے اور مختلف قوموں کے لوگوں کا ہجوم تھا جو اطراف اکناف سے آئے ہوئے تھے، ان سب کے سوالوں کا امام جواب دیتے اور فتویٰ بتاتے۔ یہی بات حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے مذکور ہے۔ بلکہ اس سے زائد یہ بھی کہ امام کی مجلس میں بڑے بڑے فقہاء اور برگزیدہ لوگ موجود تھے۔ [2] پھر امام کی بحثیں مختلف علمائے سے رہتیں جن میں امام ابن جریج، امام مالک اور امام اوزاعی جیسی ہستیاں شامل تھیں۔

اس تیاری کے ساتھ امام اعظم نے وہ کثیر المقاصد ادارہ چلایا جس کے کام کا ایک اہم ترین پہلو "تدوینِ قانون" کے عنوان سے ہمارے سامنے ہے۔

تدوینِ قانون کی تحریک

معاشرہ میں اس ضرورت کا احساس تو پیدا ہو چکا تھا کہ قانون کا کوئی ایک نظام ہو، ورنہ قاضی ذاتی اجتہادات کے تحت ایک جیسے معاملے میں متضاد فیصلے دیتے رہے تو نظامِ عدالت پراگندگی اور انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں ہم ابن المقفع کی تجویز کا ذکر کر چکے ہیں۔ [3] بعید نہیں کہ خود ابن المقفع نے امام ابوحنیفہ کے حلقۂ شاگرداں سے اس معاملے میں اثر لیا ہو۔ اس تجویز کا ایک پہلو خاصا خطرناک تھا۔ یعنی یہ کہ امیر المومنین ایک فرمان جاری کریں، مختلف لوگ احکام اور فیصلے مرتب کر کے دلائل کے ساتھ پیش کر دیں، پھر امیر المومنین اپنی رائے سے اس پورے ذخیرہ میں سے انتخاب کر لیں اور منتخب

---

[1] مناقب موفق۔ ص ۳۸ - امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔ از مولینا مناظر احسن گیلانی۔ ص ۱۵۴۔

[2] امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔ ص ۵۵۔

[3] ضحی الاسلام۔ ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ص ۲۱۸، ۲۱۹۔ چراغ راہ اسلامی قانون جلد نمبر ۲۔ حاشیہ ص ۲۶۶ - تدوینِ قانونِ اسلامی۔ الدکتور حمید اللہ۔ ص ۳۲۔ القضا فی الاسلام۔ از محمد بن محمود بن یونس۔ ص ۸۵۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔ ص ۳۰۲۔

احکام اور فیصلوں کو جاری فرما دیں جن کے خلاف فیصلہ کرنا عدالتوں کے لیے ممنوع ہو۔ ۱؎ گویا اسلامی قانون کی وضاحت طے کرنا مطلق العنان فرمانرواؤں کے ہاتھ میں چلا جائے اور شریعت وہ قرار پائے جسے قصرِ اقتدار شریعت قرار دے۔ (اس کے الفاظ میں : " وَالْفُقَهَاءُ لَيْسَ لَهُمْ وَضْعُ قَوَانِيْنَ " یعنی قانون بنانا فقہا کا کام نہیں بلکہ بادشاہ کا ہے)۔ ۲؎ اگر یہ تجویز چل جاتی تو اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس حادثہ کے اثرات و نتائج کہاں تک پہنچتے۔ مگر ہزار بگاڑ کے باوجود عباسی فرماں روا یہ خوب جانتے تھے کہ شریعت اور اسلامی قانون کے بارے میں وہ اتھارٹی نہیں ہیں اور ان کے طے کردہ قانون کا جُوا چار و ناچار کوئی اٹھا بھی لے تو اسے شریعت کبھی نہیں مانا جاسکتا۔ باوجودیکہ وہ ادوارِ مابعد اور زمانۂ حال کے حکمرانوں کی طرح علمِ دین سے کورے بھی نہ تھے بلکہ وہ اس حد تک آراستہ تھے کہ جب فقہ حنفی کے مخالف علمائے مرو کا وفد نضر بن شمیل کی سرکردگی میں مامون سے ملا اور انہوں نے دعویٰ کیا کہ فلاں فلاں مسائل میں امام ابو حنیفہ نے کتاب و سنت کی خلاف ورزی کی ہے تو بجائے حنفی قاضی خالد بن صبیح کے خود مامون ہی نے ان کی پیش کردہ دلیلوں کو ایسی حدیثوں سے توڑا جن سے خود ارکانِ وفد بے بہرہ تھے۔ ۳؎ مگر یہ بات ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ گزرتی تھی کہ محض برسرِ اقتدار ہونے کی وجہ سے وہ اتنے عقلِ کُل ہیں کہ دین و شریعت کے معاملہ میں لوگوں کے لیے اتھارٹی اور مرجع ہو سکتے ہیں۔ وہ کوئی بھی قدم اُٹھاتے ہوئے اور قانونِ شرعی کا تعین کرتے ہوئے علما ہی سے استغنا کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی ان کا عندیہ یہ ہوتا تھا کہ اہلِ علم ان کی رائے کے موافق کوئی راہ نکالیں اور ان کو ایسے دماغ مل بھی جاتے

۱؎ چراغ راہ کا اسلامی قانون نمبر ج ۲، ص ۴۸۹۔

۲؎ تصور کچھ ویسا ہی تھا جیسے پرویز صاحب کے ہاں "مرکزِ ملت" کا ہے۔

۳؎ مناقب موفق۔ ج ۲، ص ۵۶۔ (واضح رہے کہ ہارون نے مامون کو باضابطہ فقہ حنفی کی تعلیم دلائی تھی)، اسی طرح المسعودی شاہد ہے کہ ہادی نے بچوں کو حدیث پڑھائی تھی۔ حاشیہ بر کامل ابنِ اثیر ج ۸، ص ۹۷۔

تھے جو آلۂ کار بن سکیں سا اسلامی قانون کے ماہرین کو تو وہ اپنے ساتھ لینے اور نظامِ حکومت میں شریک کرنے کے لیے بے چین تھے، کجا کہ وُہ خود اجتہاد و تفقہ کی مسند پر براجمان ہوتے اور علماء کو معاشرہ میں ایک شئے زائد بنا کر پھینک دیتے۔ مامون کے دَور میں تو قصرِ اقتدار میں مجلس بحث و نظر کا تجربہ بھی ہو گیا تھا۔ مگر کسی طرح بھی وہ مجلس علماء و فقہا کی جگہ نہ لے سکی یوں بھی اقتدار وہی مضبوط ہوتا ہے کہ جو علم کو اپنے ساتھ لے، نہ وہ جو علم کو ٹھکرائے اور اس کے خلاف جبر کا محاذ کھڑا کر دے۔ جو حکومت اربابِ علم و فکر سے بے نیاز ہو کر چلنا چاہتی ہے اُس کی جڑیں جمہور کے قلوب میں نہیں اترتیں۔ جب سیاسی قوت اور علم و فکر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے چلتے ہیں اور قلم تلوار سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے تو لازماً ایک مستحکم نظام نمودار ہوتا ہے۔ پس ابن المقفع کی تجویز کا یہ جزء تو درخورِ اعتنا نہ بنا کہ علم کی سلطنت میں بھی قولِ فیصل حکمران کا قول ہو، البتہ منضبط و مدون نظامِ قانون کی ضرورت کا احساس دربار کو بھی بہ شدت ہونے لگا۔

آگے چل کر جب مدون قانون کے بغیر کام چلانا مشکل ہو گیا تو دربار کا یہ احساس باقاعدہ ایک تقاضے کی صورت اختیار کر گیا۔ ابو جعفر منصور ۱۴۸ھ میں حج کے لیے گیا تو امام مالکؒ سے خواہش کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو تمام مسلمانوں کو آپ کی فقہ پر جمع کر دیا جائے۔ ۱۶۳ھ میں دوبارہ حج کو گیا تو پھر درخواست کی۔ مگر امام نے نہیں مانا۔ [1] منصور کے اپنے الفاظ دیکھیے:-

"اے ابو عبداللہ! آپ علمِ فقہ کو ہاتھ میں لیجیے اور اس کو الگ الگ ابواب کی صورت میں مدون کر ڈالیے۔ عبداللہ بن عمر کے تشددات، عبداللہ بن عباس کی رخصتوں اور عبداللہ بن مسعود کی انفرادیات سے بچتے ہوئے ایک ایسا ضابطہ مدون کیجیے جو خیر الامور اوسطھا کے اصول پر مبنی ہو اور جو ائمہ اور صحابہ کے

---

[1] ضحی الاسلام ـ از ڈاکٹر احمد امین مصری (بحوالہ طبقات ابن سعد) ج ۱، ص ۲۲۶ ـ تدوینِ قانونِ اسلامی از ڈاکٹر حمید اللہ ـ ص ۹ (بحوالہ مقدمہ شرح موطا و زرقانی)۔ حیاتِ مالک ـ ص ۴۵۔ چراغِ راہ اسلامی قانون نمبر ج ۲، ص ۳۶۷ (حاشیہ)

متفق علیہ مسائل کا مجموعہ ہو۔ اگر آپ نے یہ خدمت انجام دے دی تو انشاء اللہ آپ کی فقہ پر ہم مسلمانوں کو مجتمع کر دیں گے اور اس کو تمام مملکت کے اندر جاری کر کے اعلان کر دیں گے کہ کسی حال میں اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔"[۱]

اگرچہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ پر یہ تحریک اثر انداز ہوئی اور اسی کے تحت اُنہوں نے موطا مرتب کر دی کہ مسلمانوں کی اہم ترین اجتماعی ضرورت پوری ہو مگر وہ اس پر کسی حال میں راضی نہ ہوئے کہ پوری مملکت کے لیے یہی واحد کتابِ قانون مقرر ہو جائے۔ منصور جو امام مالکؒ کو "اعقل الناس و اعلم الناس" مانتا تھا، اس کے اصرار کے جواب میں امام مالکؒ نے بطورِ عذر یہ دلیل دی کہ:

"امیر المومنین! آپ ہرگز ہرگز ایسا نہ کیجئے۔ دیکھئے! مسلمانوں کے پاس مختلف علماء کے اقوال پہلے سے پہنچ چکے ہیں۔ وہ حدیثیں سُن چکے ہیں اور روائتیں روایت کر چکے ہیں، لوگوں کے پاس جو بات پہلے پہنچ چکی ہے اس پر وہ عمل پیرا ہو چکے ہیں اور اسی کو اپنا دین بنا چکے ہیں۔ پس جس علاقے کے باشندوں نے جو باتیں اختیار کر لی ہیں اُن کو انہی کے حال پر چھوڑ دیجئے۔"[۲]

کتنی خدا ترس اور محتاط مبنی ہے کہ دیانتہً علم کے دائرے میں جن احکام کو امام نے اپنی جگہ قطعی حق سمجھ کر موطا قلمبند کی، ان کا بزورِ اقتدار مختلف الخیال لوگوں پر ٹھونسا جانا پسند نہ کیا۔ انہوں نے فقہ و قانون کے دائرے میں ہر کسی کے لیے اختلاف کا حق باقی رکھنا چاہا۔ پھر یہ دیکھئے کہ کتنے بڑے اعزاز اور مفاد کو رضائے الٰہی کے لیے ٹھکرا دیا۔ وہ نظریہ اور وہ علم کیا ہوا جس کا سکہ

[۱] ماہنامہ چراغِ راہ اسلامی قانون نمبر۔ ج ۲، ص ۲۹۶/۲۴۹ ۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ۔۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم ص ۲۹۰، ۲۹۱ (بحوالہ دیباج المذہب)

[۲] ماہنامہ چراغِ راہ اسلامی قانون نمبر۔ ج ۱، ص ۳۶۷ (حاشیہ)۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ص ۲۹۱ (بحوالہ میزان الکبریٰ شعرانی)۔

چلے تو جبر سے چلے اور جو محض اپنی لمعانی و تابانی کے زور سے دلوں کو مسخر کرے۔ اور امام مالکؒ کا علم اقتدار کی تائید کے بغیر دلوں کو مسخر کرتا چلا گیا اور مؤطا جسے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اصح کتب الفقہ و اشہرھا واقدمھا و اجمعھا (کتب فقہ میں سے صحیح ترین، مشہور ترین، مقدم ترین اور جامع ترین) قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ " امروز ہیچ کتاب از کتب فقہ اقوی از موطا نیست " وہ قصیدۂ سعدوں کے اس شعر کی مصداق بن کے رہی کہ ؎

دَعْ لِلْمُوَطَّا کُلَّ عِلْمٍ تُرِیْدُہٗ

فَاِنَّ الْمُوَطَّا الشَّمْسُ وَالْعِلْمُ کَوْکَبُ

(دوسرے ہر علم کی خواہش کو موطا پر نثار کر دے کیونکہ باقی سارے علوم ستارے ہیں اور موطا سورج ہے) [۱]

منصور کے بعد اس کوشش کو مہدی نے بھی جاری رکھا۔ [۲] مہدی مدینہ منورہ آیا تو ۲ ہزار اشرفیاں امام مالک کو بھجوائیں۔ اس کا حاجب دوبارہ حاضر ہوا اور مہدی کا پیغام دیا کہ آپ اُن کے ساتھ بغداد چلیے۔ امام نے اشرفیوں کے توڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حاجب سے کہا: "المال عندی علی حالہا" (یعنی واپس لے جا سکتے ہو) اور ساتھ ہی حدیث پاک کے الفاظ پڑھ دیے:

" المدینۃ خیرٌ لھم لو کانوا یعلمون "۔ [۳]

مہدی کے بعد ہارون نے پھر یہ مسئلہ اٹھایا اور امام مالکؒ سے اجازت چاہی کہ مؤطا کو کعبہ میں آویزاں کر دیا جائے۔ [۴] مؤطا سے ہارون کی دلچسپی اور امام مالکؒ کے لیے جذبۂ احترام

---

[۱] مسوّی و مصفّی شرح مؤطا از حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی۔ مقدمۂ کتاب (ذکر فضیلتِ مؤطا)

[۲] ضحی الاسلام۔ از احمد امین مصری ج ۱، ص ۲۲۰ (بحوالہ طبقات ابن سعد) تدوینِ قانونِ اسلامی۔ از ڈاکٹر حمید اللہ ص ۹ (بحوالہ مقدمہ شرح مؤطا زرقانی)، حیاتِ مالک۔ ص ۶۲۔ الزواوی ص ۱۲۸۔ چراغِ راہ اسلامی قانون نمبر ج ۱۔ ص ۲۶۷ (حاشیہ)

[۳] امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ص ۱۹۳۔ (بحوالہ معجم المصنفین۔ ج ۲، ص ۲۲۶)

[۴] حیات مالک ص ۶۶۔ ضحی الاسلام۔ از ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ج ۱، ص ۲۲۰۔)

کا عالم یہ تھا کہ ہارون مدینہ آیا تو وزیر جعفر برمکی کے ذریعے پیغام بھیجا کہ آپ مؤطا لا کر مجھے سنائیں۔ امام نے جواباً کہلا بھیجا کہ علم کسی کے پاس نہیں جایا کرتا، لوگ علم کے پاس آتے ہیں۔ اس کے بعد امام خود ہی ہارون سے ملنے چلے گئے۔ ہارون نے اپنے پیغام کا ذکر کر کے گلہ کیا۔ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بادشاہت و اقتدار سے نوازا ہے، اب اگر آپ ہی علم کی عزت کو غارت کریں گے تو خطرہ ہے کہ اللہ تعالےٰ آپ کی عزت کو برباد نہ کر دے۔ اس پر ہارون موطا سننے کے لیے آپ کے ساتھ ہو گیا۔ امام نے ہارون کو مسند پر اپنے پہلو میں بٹھا لیا اُس نے کہا کہ آپ ہی موطا پڑھ کر سنائیے۔ امام نے فرمایا کہ عرصہ سے میں پڑھ کر سنانا چھوڑ چکا ہوں۔ پھر اس نے کہا کہ اچھا دوسرے لوگوں کو نکال دیجیے تاکہ میں آپ کو تنہائی میں پڑھ کر سناؤں۔ امام نے فرمایا کہ اگر خواص کی خاطر عوام کو علم سے محروم کیا جائے تو پھر خواص کے لیے اس میں نفع نہیں رہتا۔ آخر امام کے حکم سے معن بن عیسیٰ قرائت شروع کرنے لگے تو امام نے ہارون سے فرمایا کہ اس شہر میں اہلِ علم کا دستور یہ ہے کہ وہ علم کے لیے تواضع کرنا پسند کرتے ہیں۔ ہارون فوراً مسند سے اُترا اور فرش پر بیٹھ کر ادب سے موطا سننے لگا۔ [1]

یہ منازل تھیں جنہیں ہارون نے اس غایت سے سر کیا کہ حکومت کے ہاتھ میں مدینہ النبیؐ کے مستند اور معتمد علیہ محدث و فقیہ کی مرتب کردہ کتابِ قانون آ جائے۔ اقتدار کوچۂ علم میں سر کے بل چل کے پہنچا۔ مگر امام اپنی اُسی سوچی سمجھی ہوئی دلیل کی بنا پر مؤطا کو اقتدار کے ہاتھ میں دینے پر تیار نہ ہوئے۔

اتنی داستان ہم نے اس لیے بیان کی کہ یہ امر واضح ہو جائے کہ معاشرہ میں ایک منضبط کتابِ قانون کی ضرورت کا شدید احساس ایوانِ ادب سے لے کر قصرِ اقتدار تک ہر جگہ پیدا ہو چکا تھا اور متواتر تین فرماں رواؤں نے اسی غرض کے لیے امام مالکؒ کے دروازے پر دستک دی۔ اس ضرورت کو شاید امام ابوحنیفہ نے دوسروں سے ذرا پہلے اور خوب اچھی طرح

[1] ترجمان السنۃ۔ از مولانا محمد بدر عالم میرٹھی۔ ص ۲۴۲، ۲۴۳!

محسوس کر لیا تھا اور پھر اس کے احساس کی مزید آبیاری بھی ان کے نظریات اور ان کے کام سے ہوتی رہی۔

فی الحقیقت اسلامی قانون کی تدوین کا اہم کام خود دورِ نبوت ہی میں شروع ہوا، مگر وہ چند ہدایت ناموں اور ضابطوں پر مشتمل تھا۔ ۱؎ اسی طرح اس کام میں کچھ اضافہ خلفائے راشدین، خصوصاً حضرت عمرؓ کے بعض مکاتیب اور تحریری فرمانوں سے ہوا۔ علاوہ بریں حضرت علیؓ (جو افتاء اور قضا پر مامور رہ چکے تھے) کے فتاویٰ کا ایک مجموعہ حضرت ابنِ عباسؓ (ف: ۶۸ھ) کے سامنے پیش کیا گیا۔ پھر امام زید بن علی کی طرف اسلامی فقہ و قانون کے موضوع پر کتاب المجموع کے نام سے ایک کتاب منسوب ہے جو نایاب ہو گئی۔ ۲؎ زرقانی کے بقول حضرت امام مالکؒ سے پہلے امام ابن الماجشون (ف: ۱۶۴ھ) نے مؤطا مرتب کی اور اس میں احادیث کو فقہی ابواب کے مطابق درج کیا۔ عجیب بات ہے کہ اسی زرقانی کے حوالے سے گولڈ سیہر (مستشرق) نے سب سے پہلی مؤطا کو العامری محمد بن عبدالرحمٰن (ف: ۱۵۹ھ) مشہور بہ ابن ابی ذئب سے منسوب ٹھہرایا ہے۔ ۳؎

یعنی تدوینِ قانون کی ضرورت بھی پہلے سے تھی اور کام بھی پہلے سے ہو رہا تھا۔ مگر اب یہ ضرورت اس وجہ سے ایک نئی شکل میں سامنے آئی کہ اسلام کے دُور دُور تک پھیل جانے، نئی نئی قومیں اور نسلوں کے مسلمان ہو جانے، فکری رہنمائی دینے والے مرکزی عنصر کے بکھر جانے اور مختلف نقطۂ ہائے نظر کے اُبھر آنے کی وجہ سے ایک انتشار پیدا ہونے لگا۔ معاملہ کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ نئے نئے حالات و مسائل کا سامنا تھا اور احکام کو از سرِ نو منطبق کرنے کے لیے اجتہادی کاوشوں کی ضرورت تھی۔ علمائے حق کی نگاہ میں بڑے پیمانے پر تدوینِ فقہ کی ضرورت ایک اور وجہ سے بھی تھی اور وہ یہ تھی کہ اقتدار اور علم کے درمیان ایک طرف اور بیرونی اثرات اور

۱؎ تدوینِ قانونِ اسلامی ـ از ڈاکٹر حمید اللہ ـ ص ۲۰، ۲۱

۲؎ ایضاً ـ ص ۲۱ ـ ۳؎ ایضاً ـ ص ۲۱

ملت کی دینی زندگی کے مابین۔ دوسری طرف، جو کشاکش بنوامیہ کے دور سے شروع ہو کر اب تیز تر ہو چکی تھی اور اس سے نجات پانے کے لیے دو تین مساعئ انقلاب ناکام ہو چکی تھیں، اس سے عہد برآ ہونے اور اسلامی قانون کو اس کی لپیٹ میں آنے سے بچانے کے لیے نہایت ضروری تھا کہ قانون کے تمام اجزا کو سینوں سے سفینوں میں منتقل کر دیا جائے اور اسے مکمل نظام اور سسٹم کی شکل میں مدون کر دیا جائے۔

ملت کی یہ عظیم خدمت تھی جسے حضرت امام ابوحنیفہ نے عہدہ و جاہ سے اپنے آپ کو کنارہ کش رکھ کر اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ اگر عہدہ قبول کر لیتے تو مطلق العنان اقتدار انہیں پوری طرح نگل کر ہضم نہ بھی کر لیتا تو اس صورت میں بھی یہ کارنامۂ زریں ہرگز انجام نہ پا سکتا۔ جو دوسری صدی کے آغاز سے وسط تک جاری رہا۔ (باقی آئندہ)

(بقیہ مطبوعات)

قرآن مجید کی کچھ سورتوں کا مطلب یہ کتاب سورۂ فاتحہ اور آخری ۱۹ سورتوں کے ترجمہ و تشریح پر مشتمل ہے۔ مصنف پہلے مختصر طور پر سورۃ کا مطلب بیان کر دیتا ہے اور پھر اس کا لفظی ترجمہ نقل کر دیتا ہے۔ سورتوں کا عربی متن درج نہیں کیا گیا۔ ترجمہ و تشریح میں بظاہر کوئی نقص یا عیب نظر نہیں آیا۔ البتہ عربی متن کو ساتھ شامل نہ کرنا درست نہیں ہے۔ مصنف (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) اردو قرآن کو رائج کرنے کے اسکیم رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے تنزل اور اسلام سے بُعد کا سبب یہ تھا کہ قرآن عربی میں ہے اور لوگ عربی قرآن کو سمجھتے نہیں ہیں۔ اس لیے قرآن کی دعوت کو عورتوں اور بچوں تک عام کرنے کے لیے اردو قرآن کو رواج دیا جائے۔ لیکن مصنف کا یہ نظریہ انتہائی خطرناک ہے۔ عربی قرآن میں تحریف کی گنجائش نہیں ہے مگر اردو قرآن کو تحریف و تغیر سے کون محفوظ رکھ سکے گا۔ افسوس ہے کہ مصنف کی یہ محنت قرآن کی صحیح خدمت نہیں قرار دی جا سکتی۔ کتاب ٹائپ پر خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ چھپی ہے اور مرحوم کے اوقاف سے مفت تقسیم کی جا رہی ہے۔ ملنے کا پتہ درج نہیں ہے۔ ناشر سید جمیل حسین رضوی لاہور ہیں۔

رسائل و مسائل

علم غیب، حاضر و ناظر، اور سجود لغیر اللہ کے مسائل

سوال:- تفہیم القرآن زیر مطالعہ ہے۔ شرک کے مسئلہ پر ذہن اُلجھ گیا ہے۔ براہِ کرم رہنمائی فرمائیں۔ تفہیم القرآن کے بغور مطالعہ سے یہ امر ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی مخصوص صفات ہیں عالم الغیب ہونا اور سمیع و بصیر ہونا جس کے تحت ہمارے مروجہ الفاظ حاضر و ناظر بھی آجاتے ہیں یعنی شامل ہیں۔ خدا کے سوا کسی کو بھی ان صفات سے متصف سمجھنا شرک ہے۔ اور مخلوق میں سجدہ، رکوع وغیرہ بھی ذات باری سے مختص ہیں۔ شرک کو خداوند تعالیٰ نے جرم عظیم اور ناقابل معافی گناہ قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے جرم کا وہ خود کسی کو حکم نہیں دے سکتا۔ مگر فرشتوں کو آدم کے لیے سجدہ کا حکم دیا۔ اسی طرح کوئی نبی نہ تو شرک کرتا ہے اور نہ کرواتا ہے۔ مگر حضرت یوسفؑ کے سامنے ان کے بھائیوں اور والدین نے سجدہ کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر سجدہ غیر اللہ کے لیے شرک ہے تو مندرجہ بالا واقعات کی کیا توجیہہ ہو گی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ علم غیب اگر خداوند تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے تو یہ کسی بھی مخلوق میں نہ ہونی چاہیے۔ لیکن قرآن و حدیث اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ انبیاء و رسل کو علم غیب ملتا ہے۔ پھر کسی مخلوق میں یا کسی فرد میں اس صفت کو ہم تسلیم کریں تو مرتکب شرک کیوں ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کا علم دے رکھا تھا تو آخر اسے مشرک کیوں کہا جائے؟ بعض لوگوں کے خلاف اسی بنا پر شرک کے ارتکاب کا فتویٰ لگایا جاتا ہے۔ وہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت علم غیب کو

ذاتی یا نفسی نہیں کہتے بلکہ خدا کی دین قرار دیتے ہیں۔ ان کا اور دوسرے علما کا اگر اختلاف ہے تو صرف کم یا زیادہ پر ہے۔ جب مسئلہ کم وبیش کا ہی ہے تو پھر فتویٔ شرک کیوں؟

حاضر و ناظر کی صفت بھی خداوند تعالیٰ سے مختص قرار دی جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو یہ طاقت بخشی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں انسانوں، حیوانوں، پرندوں، چرندوں اور جنوں کی رُوحوں کو قبض کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ وُہ حاضر و ناظر ہے اور حاضر و ناظر ہونا خدا کی مخصوص صفت ہے یہاں اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرض کی انجام دہی کے لیے اپنی خاص صفت فرشتہ میں ودیعت کر رکھی ہے تو جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں صفت حاضر و ناظر کا ہونا اور خدا کی طرف سے عطا کیا جانا مانتے ہیں آخر انہیں مشرک کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب:۔ آپ نے شرک کے مسئلے میں اپنی جو الجھنیں بیان فرمائی ہیں، یہ تفہیم القرآن کے مسلسل مطالعہ سے بآسانی رفع ہو سکتی ہیں۔ میرے لیے ایک خط میں ان کو تفصیلاً رفع کرنا مشکل ہے۔ تاہم چونکہ "شرک" کا معاملہ بڑا ہی نازک اور خطرناک ہے، اور میں نہیں چاہتا کہ آپ اس الجھن میں زیادہ دیر تک مبتلا رہیں، اس لیے اختصار کے ساتھ چند الفاظ میں آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔

سب سے پہلے آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ سجدہ بجائے خود شرک نہیں ہے بلکہ شرک کی علامت ہے۔ اصل میں شرک تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک فی الذات یا فی الصفات یا فی الحقوق ٹھیرانا ہے۔ سجدہ اگر اس طرح کے کسی عقیدے کے ساتھ ہو تو شرک ہے ورنہ اس فعل سے چونکہ مشرکین کے ساتھ عملاً مشابہت ہوتی ہے اس لیے اسے بجائے خود شرک ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ اس مشابہت کی بنا پر ممنوع ٹھیرایا گیا ہے۔ تخلیق آدم کے وقت اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خود حکم دیا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ اس لیے فرشتوں نے جو کچھ کیا وہ اللہ عزوجل کے حکم صریح کی تعمیل میں تھا۔ بطور خود وہ آدم کو قابل پرستش یا قابل تعظیم

سمجھ کر نہیں جھک گئے تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس میں شرک کا کوئی شائبہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت یوسفؑ کے سامنے والدین اور بھائیوں نے جو سجدہ کیا وہ اُس رویائے صادقہ کی بنا پر تھا جو قرآن کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے خود دکھایا تھا، جسے حضرت یعقوب علیہ السلام نے الٰہی اشارہ قرار دیا تھا (سورہ یوسف آیات ۴ تا ۶)، اور جس کو حضرت یوسف نے بھی آخر کار اسی خواب کا مصداق ٹھیرایا (سورہ یوسف آیت ۱۰۰) اس لیے یہاں بھی جو کچھ ہوا اللہ کے حکم سے ہوا، اور ظاہر ہے کہ جو کام اللہ کے حکم کی تعمیل میں کیا جائے وہ شرک نہیں ہو سکتا۔

اب اُس شخص کے معاملے کو لیجیے جو اللہ تعالیٰ کے کسی فرمان کے بغیر کسی بندے کو معظم و مقدس سمجھ کر بطور خود اس کے آگے سجدہ بجا لائے۔ کیا کسی دلیل سے اس فعل کو بھی غیر مشرکانہ کہا جا سکتا ہے؟ کیا یہ استدلال صحیح ہو سکتا ہے کہ جب اللہ نے پہلے دونوں معاملوں میں سجود لغیر اللہ کو جائز رکھا ہے تو یہ فعل مطلقاً جائز ہے؟ یا یہ کہ ہم خدا کے حکم کے بغیر خود جسے چاہیں تعظیماً سجدہ کر سکتے ہیں؟ سورۂ کہف میں اللہ تعالیٰ اپنے ایک خاص بندے کے متعلق ہمیں بتاتا ہے کہ اُس نے فلاں فلاں مصالح کی بنا پر حکم خداوندی سے کچھ مساکین کی کشتی عیب دار کر دی، اور ایک لڑکے کو قتل کر دیا۔ کیا اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ ہم بھی مصلحت دیکھ کر جس کے مال کو چاہیں نقصان پہنچا دیتے اور جسے چاہیں قتل کر دینے کے مجاز ہیں؟ جب اللہ اور اس کے رسولؐ نے نصوص شرعیہ کے ذریعہ سے غیر اللہ کے لیے سجدے کو حرام کر دیا ہے، اور دوسروں کی جان و مال میں تصرف کے لیے حدود مقرر کر دیے ہیں، تو کسی شخص کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض خصوصی افعال کو نظیر قرار دے کر اور ان پر قیاس کر کے ان ممنوعات کو اپنے لیے مباح کر لے؟

علم غیب کے مسئلے میں یہ بات سب مانتے ہیں کہ کلّی و ذاتی علم غیب اللہ کے لیے مخصوص ہے اور اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ اپنے علم غیب کا جو حصہ اور جتنا حصہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے دے سکتا ہے۔ یہ جزئی اور عطائی علم غیب اپنی نوعیت میں اُس کلی و ذاتی علم غیب سے

بالکل مختلف چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخصوص صفت ہے۔ اور کسی بندے کے حق میں اس دوسری نوعیت کے علم غیب کا عقیدہ رکھنا کسی کے نزدیک بھی شرک نہیں ہے۔ دراصل خرابی جس مقام سے شروع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ عقیدت میں غلو کر کے دو ایسی باتیں ایجاد کر لیتے ہیں جو اصل اسلامی عقیدے سے متصادم ہوتی ہیں۔

اوّل یہ کہ وہ اس عطائی علم غیب کو جزئی نہیں بلکہ کُلی بنا دیتے ہیں اور کسی بندے کے حق میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے اُسی طرح جمیع ما کانَ و ما یکون کا عالم بنا دیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود ہے۔ بظاہر یہاں جزئی و کلی کا فرق دُور ہو جانے کے باوجود ذاتی اور عطائی کا فرق نظر آتا ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنا شرک نہیں ہے۔ لیکن تھوڑا سا بھی آپ غور کریں تو آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ اس طرح کا عقیدہ رکھنے میں کتنا عظیم خطرہ مضمر ہے۔ بالفرض اگر یہ جائز ہو کہ اللہ اپنی عطا سے کسی بندے کو اپنے ہی جیسا عالم الغیب والشہادۃ بنا دے، تو آخر یہ کیوں نہ جائز ہو کہ وہ اسے اپنی ہی طرح قادرِ مطلق، اور حی و قیوم، اور خالق و رب بھی بنا دے؟ اس کے بعد خدا کی عطا سے کسی بندے کے خدا بن جانے میں آخر کیا رکاوٹ باقی رہ جاتی ہے؟ پھر کیا دو مساوی صفات و اختیارات رکھنے والے خداؤں کے درمیان صرف ذاتی اور عطائی کا فرق شرک سے بچانے کے لیے کافی ہو گا؟

دوسری زیادتی غالی حضرات یہ کرتے ہیں کہ اللہ کے عطیے کو خود بانٹنے کے مختار بن جاتے ہیں۔ یہ بتانا کہ عطا فرمانے والے نے کسی کو کیا عطا کیا ہے اور کیا نہیں کیا ہے درحقیقت خود عطا فرمانے والے ہی کا کام ہے۔ دوسرے کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ معطی کے اپنے بیان کے بغیر وہ بطورِ خود یہ فیصلہ کر دے کہ دینے والے نے کیا کچھ کسی کو عطا فرمایا ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پاک میں کہیں یہ فرمایا ہو کہ ”میں نے اپنے فلاں بندے کو جمیع ما کان و ما یکون کا عالم بنا دیا ہے“ یا اللہ کے رسول نے کسی صحیح حدیث میں اس کی صراحت کی ہو، تو اس کا حوالہ دے دیا جائے ساری بحث ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر نہ کوئی آیت اس کی تصریح کرتی ہے نہ کوئی حدیثِ صحیح

تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے اس عطیے کی خبر لوگوں تک آخر کس ذریعہ سے پہنچی ہے؟

اس مسئلے میں یہ بات خوب سمجھ لیجئے کہ عقیدے، اور خصوصاً عقیدۂ توحید کا معاملہ بڑا ہی نازک ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس پر کفر و ایمان اور فلاح و خسران کا مدار ہے۔ اس معاملہ میں یہ طرزِ عمل صحیح نہیں ہے کہ مختلف احتمالات رکھنے والی آیات اور احادیث میں سے ایک مطلب نچوڑ کر کوئی عقیدہ بنا لیا جائے اور اسے داخلِ ایمانیات کر دیا جائے۔ عقیدہ تو صاف اور صریح محکمات سے ماخوذ ہونا چاہیے جن میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے ایک بات ماننے کی دعوت دی ہو، اور یہ ثابت ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تبلیغ فرماتے تھے، اور صحابۂ کرام و تابعین و تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین اس پر اعتقاد رکھتے تھے۔ کیا کوئی شخص بتا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب والشہادہ ہونے یا جمیع ماکان و مایکون کے عالم ہونے کا عقیدہ یہ نوعیت رکھتا ہے؟ اگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا تو آخر آپ اپنے آپ کو اس خطرے میں کیوں ڈالیں؟

حاضر و ناظر کے معاملے میں آپ نے ملک الموت کی جو مثال پیش کی ہے اس میں کئی غلطیاں ہیں۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے، اور نہ کسی حدیث صحیح میں یہ آیا ہے کہ ساری کائنات کا ملک الموت ایک ہی ہے۔ یہ بات بھی قرآن سے نہیں معلوم ہوتی کہ صرف ایک فرشتہ قبضِ ارواح کا کام کرتا ہے بلکہ متعدد مقامات پر روح قبض کرنے والے فرشتوں کا ذکر بصیغہ جمع آیا ہے، مثلاً

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ (النساء: ۹۷)	جن لوگوں کو ملائکہ نے اس حال میں وفات دی کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے تھے اُن سے ملائکہ نے پوچھا کہ تم یہ کس حال میں تھے۔
فَكَیْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ (محمد: ۲۷)	پھر کیا بنے گی اُس وقت جب ملائکہ ان کو وفات دیں گے ان کے چہروں اور پیٹھوں کو پیٹتے ہوئے۔
اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ	جن لوگوں کی رُوحیں ملائکہ اس حال میں قبض کرتے

سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ (النحل: ۲۸) کہ وہ پاکیزہ لوگ تھے ان سے وہ کہیں گے کہ سلامتی ہو تم پر۔

حَتّٰى إِذَا جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوا أَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ (الاعراف: ۳۷) یہاں تک کہ جب ہمارے فرشتے ان کے پاس روحیں قبض کرنے کے لیے آئیں گے تو ان سے پوچھیں گے کہ کہاں ہیں وہ جن کو تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے تھے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑے ملک الموت کے تحت بہت سے دوسرے مددگار فرشتے بھی ہیں جو روحیں قبض کرنے پر مامور ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ابلیس ایک بڑا شیطان ہے اور اس کی ماتحتی میں بے شمار شیاطین ہیں جو دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر جگہ نہ ابلیس جاتا ہے نہ ملک الموت۔

پھر خود اس زمین کی مخلوقات کے بارے میں بھی کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ تمام خشکی و تری اور ہوا کے جاندار نسل کا ملک الموت وہی ایک ہے جو انسانوں کی جان لینے کے لیے مقرر ہے۔ قرآن میں تو صرف یہ فرمایا گیا ہے کہ یتوفاکم ملک الموت (تمہاری روحیں ملک الموت قبض کرتا ہے)۔ اس سے جو بات نکلتی ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اس زمین پر انسانوں کی روحیں قبض کرنے پر ایک فرشتہ مامور ہے۔ اگر بالفرض ہی ایک فرشتہ روئے زمین پر تمام مرنے والوں کی روحیں قبض کرتا ہے تب بھی یہ بہت ہی محدود پیمانے کی ایک طاقت ہے جو اللہ نے اپنے اس فرشتے کو عطا فرمائی ہے۔ اس کو آخر اللہ تعالیٰ کی اس لامحدود صفت سے کیا نسبت ہے کہ وہ ساری کائنات میں حاضر و ناظر ہے؟ پھر مزید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اور آپ کیا اب قیاسات پر اپنے عقائد کی عمارت کھڑی کریں گے؟ ملک الموت کے متعلق تو اللہ تعالیٰ نے خود بتایا ہے کہ ہم نے اسے انسانی روحیں قبض کرنے پر مامور کیا ہے۔ اس پر زیادہ سے زیادہ جو تصور قائم کیا جا سکتا ہے وہ بس اسی قدر ہے کہ یہ فرشتہ بیک وقت روئے زمین کے ہر حصے میں

لاکھوں انسانوں کی روحیں قبض کر لیتا ہے۔ مگر کیا اس پر یہ قیاس بھی کیا جا سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ موجود ہیں اور سب کچھ دیکھ رہے ہیں؟ ان دونوں باتوں میں آخر کیا مناسبت ہے کہ ایک کو دوسری پر قیاس کر لیا جائے؟ اور پھر قیاس بھی ایسا کہ وہ عقیدہ قرار پائے اور ایمانیات میں داخل ہو اور لوگوں کو اس پر ایمان لانے کی دعوت دی جائے اور نہ ماننے والوں کے ایمان میں نقص ثابت کیا جانے لگے؟ یہ عقیدہ اگر واقعی اسلامی عقائد میں شامل ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اس کی تصریح فرماتا کہ میرے رسولؐ کو حاضر و ناظر تسلیم کرو، حضورؐ خود یہ دعویٰ فرماتے اور اسے ماننے کی دعوت دیتے کہ میں ہر جگہ موجود ہوں اور قیامت تک حاضر و ناظر رہوں گا، صحابہ کرام اور سلف صالحین میں یہ عقیدہ عام طور پر شائع و ذائع ہوتا اور عقائد اسلام کی کتابوں میں اسے ثبت کیا جاتا۔

آپ نے بعض حضرات کو مشرک کہنے یا نہ کہنے کا جو ذکر فرمایا ہے اس کے بارے میں میری رائے شاید آپ کو معلوم نہیں ہے۔ میں ان مسائل میں ان کے خیالات کو تاویل کی غلطی سمجھتا ہوں، اور رائے غلط کہنے میں تامل نہیں کرتا۔ مگر مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ انہیں مشرک کہا جائے اور مشرکین عرب سے تشبیہ دی جائے۔ میں ان کے بارے میں یہ گمان نہیں رکھتا کہ وہ شرک کو شرک جانتے ہوئے اس کے قائل ہو سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ توحید ہی کو اصل دین مانتے ہیں اور اسی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس لیے انہیں مشرک کہنا زیادتی ہے۔ البتہ انہوں نے بعض آیات اور احادیث کی تاویل کرنے میں سخت غلطی کی ہے اور میں یہی امید رکھتا ہوں کہ اگر ضد دلانے والی باتیں نہ کی جائیں بلکہ معقول طریقے سے دلیل کے ساتھ سمجھایا جائے تو وہ جان بوجھ کر کسی گمراہی پر اصرار نہ کریں گے۔

قارئین کی خدمت میں معذرت

ترجمان القرآن کے کاتب مولوی محمد صدیق صاحب کی والدہ صاحبہ کی وفات کی وجہ سے ترجمان القرآن کی کتابت ایک نئے کاتب سے کروائی گئی۔ اگر کوئی نقص محسوس ہو تو درگذر کریں۔ منیجر

مطبوعات

یورپ نامہ (حصہ اوّل) ترکی، یوگوسلاویہ، آسٹریا، سوئٹزرلینڈ تالیف حکیم محمد سعید دہلوی صاحب۔ ناشر: ہمدرد اکیڈمی نیو ٹاؤن۔ کراچی نمبر ۵ قیمت آٹھ روپے۔ صفحات ۴۹۵

حکیم محمد سعید دہلوی نے ۱۹۵۶ء میں اپنے بھائی کی معیت میں یورپ کا سفر کیا۔ اس سفر کی غرض و غایت تفریح نہ تھی بلکہ اس سے دونوں بھائیوں کا مقصد دوا سازی کے ایسے اداروں کا مطالعہ کرنا تھا جو تحقیق کا کام کر رہے ہیں اور ایسی انجمنوں کے کاموں کا جائزہ لینا تھا جو طب و سائنس کے میدان میں شب و روز مصروف ہیں۔ ان بھائیوں نے گو رخت سفر صرف اسی ایک مقصد کے لیئے باندھا لیکن انہوں نے جب چشم بینا اور دل حسّاس کے ساتھ یورپ کے مختلف ممالک کا جائزہ لیا۔ تو ان کے تاریخی، جغرافیائی، علمی، ادبی، تعلیمی اور ثقافتی مسائل بھی ان کی آنکھوں کے سامنے آگئے اور انہوں نے اپنے اس سفرنامے میں ان پر بھی بحث کی ہے۔ یوں تو یہ سفرنامہ دلچسپ اور معلومات افزا ہے لیکن ہمیں فاضل مصنف کے بعض نظریات سے شدید اختلاف ہے خصوصاً اتاترک کی اصلاحات کے متعلق انہوں نے تعریف و توصیف کا جو لہجہ اختیار کیا ہے وہ ہمیں مبنی بر انصاف دکھائی نہیں دیتا۔ ناموں کی تبدیلی اور رسم الخط کی تبدیلی سے ترکی قوم خود اپنے ماضی سے کٹ گئی اور دنیا کی ساری بدنصیب قوموں میں شاید یہ واحد قوم ہے جسے اپنے گھر کے اندر ہی اجنبی بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ ہم اتاترک کی نیت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے اس کا معاملہ اب اللہ کے پاس ہے لیکن ہم اس کی ذہنیت کے بارے میں یہ بات قدرے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کسی صحت مند انسان کی ذہنیت نہ تھی بلکہ ایک بیمار ذہن نے مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر ترکوں کو قوت اور طاقت کے زور سے مغربی تمدّن کا پرستار بنانے کی مذموم کوشش کی۔

اس نے بلاشبہ ترکی کو غیر ملکی سامراج کے چنگل سے نجات دلائی لیکن ملک کے اندر نفاق و فساد کے ایسے بیج بو دیئے جن سے ترکی کے اندر مستقل خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

پھر صفحہ پر علماء کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھی بالکل غلط اور حالات کے ناقص مطالعہ پر مبنی ہے اور علماء پر حملہ جس وجہ سے کیا گیا ہے وہ بڑا افسوس ناک ہے۔ زندگی کا کونسا شعبۂ حیات ایسا ہے جس میں کالی بھیڑیں نہیں ہوتیں۔ یہی حال علماء کا بھی ہے۔ بعض دنیا پرستوں نے دنیا کے لالچ میں دینی علم سے صحیح کام نہیں لیا لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ بحیثیتِ مجموعی دین کی جتنی خدمت اس مقدس گروہ نے کی ہے، اور کسی گروہ نے نہیں کی۔ ان بے چاروں نے برسرِاقتدار لوگوں کے ظلم و ستم سہہ کر، اپنے اور پرایوں کا ہدفِ ملامت بن کر، بھوکے رہ کر اور بسا اوقات جان کی بازی لگا کر بھی جس بے جگری سے جاہلیت کا مقابلہ کیا ہے۔ اس کی نظیر مذہب کی تاریخ میں ناپید ہے۔

علماء پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ وہ رفتارِ زمانہ کا ساتھ نہیں دیتے۔ فاضل مصنف نے بھی علماء کے خلاف جو چارج شیٹ مرتب کی ہے اس میں بھی اسی جرم کو سرِفہرست رکھا گیا ہے لیکن یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ اسلام ایک مستقل تحریک فکر و عمل ہے۔ اس کی اپنی الگ اقدار ہیں۔ یہ مابعدالطبعی مسائل سے لے کر عملی زندگی کی معمولی سے معمولی جزئیات تک ایک خاص طرزِ فکر کی حامل ہے۔ اس لیے زندگی کے نت نئے ابھرتے ہوئے مسائل کے بارے میں یہ ایک مخصوص نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔ لہٰذا یہ ہر ابھرتی ہوئی تحریک کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ علماء چونکہ اس کے مزاج سے پوری طرح واقف ہیں۔ اس لیے ان کے سامنے جب بھی کوئی نئی چیز آئی تو انہوں نے اس کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر سے فیصلہ دیا۔ علماء کسی احساس کمتری میں مبتلا نہ تھے کہ وہ ہر بدعت کا خواہ اس میں جہنم کی آنچوں کا اثر ہو، دیوانہ وار خیر مقدم کرتے۔ انہوں نے بجا طور پر بعض غیر اسلامی افکار اور نظریات کی مخالفت کی۔ کتاب کی زبان شستہ اور رواں ہے، اور معیار کتابت و طباعت عمدہ۔

حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ

تالیف محمد ابوزہرہ، پروفیسر فواد یونیورسٹی مصر۔
ترجمہ:۔ سید رئیس احمد جعفری۔ ناشر:۔ المکتبۃ السلفیہ

شیش محل روڈ، لاہور۔

امت مسلمہ نے تجدید و احیائے دین کے لیے جو نامور شخصیتیں پیدا کی ہیں ان میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ ایک نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے ایک ایسے دور میں آنکھیں کھولیں جو فکری اور عملی اعتبار سے انحطاط کا زمانہ تھا۔ زندگی کا کوئی شعبہ اور مسلمانوں کے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہ تھا جس میں انتشار اور اضمحلال نہ پیدا ہو چکا ہو۔ بغداد کی تباہی اور تاتاریوں کے دہشت انگیز اور وحشیانہ مظالم کی داستان ابھی لوگوں کے ذہنوں میں بالکل تازہ تھی کہ شیخ الاسلام نے شعور کی آنکھیں کھولیں۔ مسلمانوں پر ادبار کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ سوسائٹی کے سارے طبقوں میں زبردست بگاڑ پیدا ہو چکا تھا۔ دین جو مسلم سوسائٹی کی سب سے بڑی قوت اور طاقت رہا ہے۔ وہ اپنی روح کھو چکا تھا۔ ہر مذہب کے پیرو اپنے فقہی مسلک کو تمام مذاہب فقیہ سے افضل و اعلیٰ مقبول و مؤید من اللہ سمجھتے تھے۔ ان کی تمام ذہانت اور فطانت اس کی ترجیح اور اس کی افضلیت ثابت کرنے میں صرف ہوتی تھی۔ ہر فقہی مسلک دوسرے کی گمراہی پر مصر تھا۔ متکلمانہ موشگافیوں نے تمام دوسرے مباحث کو نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ اور یہ ذوق ہر ذوق پر غالب آچکا تھا۔ تصوف میں بہت سے غیر اسلامی افکار و تصورات شامل ہو کر اس کو گدلا کر چکے تھے اور بہت سے پیشہ ور جاہل غیر محقق اور مبتدع اپنے آپ کو صوفیا میں شمار کر کے عوام و خواص کو دین حق سے دور لے جانے میں مصروف تھے۔ بدعات کا سوسائٹی میں عام چرچا تھا۔

مسلمانوں میں بہت سے اصحاب فکر یونان کے گمراہ کن فلسفہ کے طلسم میں گرفتار تھے ارسطو اور افلاطون کے نظریات ان کے نزدیک ایک مقدس اور ہر عیب و خطا سے پاک سمجھے جاتے تھے یہ تھے وہ مختصر حالات جن میں حضرت امام ابن تیمیہ نے اصلاح و تجدید کا کام شروع کیا۔

مصر کے مشہور و معروف عالم ابوزہرہ نے زیر تبصرہ کتاب میں امام صاحب کی اصلاحی اور

تجدیدی کوششوں کا ہمدردانہ دیانت داری کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ فاضل مصنف کی ہر تحقیق میں فداؤنت کا استناد ہے اور ہر تعبیر میں جدت کی تازگی۔ یہ عجیب حکیمانہ امتزاج ہے اور ان کی فضیلت اور اسلوب بیان کا طغرائے امتیاز۔

فاضل مصنف نے سیرتوں کا یہ سیٹ، جس کی یہ کتاب ایک نہایت اہم کڑی ہے، فقہی افکار کے ارتقاء کے نقطۂ نظر سے لکھا ہے۔ اس لئے ان کا زور بیان زیادہ تر اسی موضوع پر صرف ہوا ہے۔ اس انہماک کی وجہ سے شیخ السلام کی حیات کے بعض ضروری گوشے نظر انداز ہو گئے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی صاحب نے ان ضروری گوشوں کی نقاب کشائی کر کے اس بے نظیر کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ انہوں نے یہ کام جس محنت شاقہ سے سرانجام دیا ہے اس کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جسے اس نوعیت کے کام کرنے کا اتفاق ہوا ہو۔ کتاب جس حالت میں ہمارے سامنے موجود ہے یہ محض امام ابن تیمیہ رح کی سیرت نہیں بلکہ ان کے علوم و معارف کا بیش بہا خزینہ ہے۔ فاضل مصنف نے ہر بحث کے ساتھ ساتھ صرف امام موصوف کا نقطۂ نظر پیش کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کو نگاہ میں رکھ کر اس پر کلام کیا ہے۔ اس لیے انکے خیالات میں بڑا اسلجھاؤ نظر آتا ہے۔ یہ کتاب اس اعتبار سے کسی غالی معتقد کی مدح سرائی نہیں بلکہ ایک غیر جانبدار مبصر اور ایک فاضل مصنف اور ایک اہل دل مسلمان کا امام ابن تیمیہ کی سیرت و کردار اور ان کے افکار و نظریات کا نہایت حکیمانہ اور عالمانہ جائزہ ہے۔ کتاب کے آخر میں اشخاص و فرق اور اماکن و کتب کے نہایت مکمل اشاریے لگا دیئے گئے ہیں۔

ہم اس قابلِ قدر کتاب کی اشاعت پر مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ مادہ پرستی کے اس دور میں کسی شخص کا اس صبر آزما کام کی طرف متوجہ ہونا، اس کے گہرے خلوص اور عزم پر دلالت کرتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ ان لوگوں کے لیے بڑا مفید ہو گا جو اس دور میں تجدید و احیائے دین کے لیے تڑپ رکھتے ہیں۔ کتاب ۸۸۱ صفحات پر مشتمل ہے، اور قیمت ۱۲ روپے۔ کتابت اور طباعت کا معیار عمدہ۔ (باقی دیکھو صفحہ ۳۹)

نئی مطبوعات

حسب ذیل کتابیں نئی طبع ہو کر ہمارے ہاں آگئی ہیں
اب آپ اپنی ضرورت کے مطابق طلب فرما سکتے ہیں

اذکارِ مسنونہ

از امام ابن قیمؒ ترجمہ و حواشی از مولانا خلیل احمد حامدی، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازیں اور نماز کے علاوہ پڑھی جانے والی دعاؤں اور اذکار کا مجموعہ ــــ قسم اعلیٰ مع دیدہ زیب گردپوش ۳/۷۵ ــــ سستا ایڈیشن ۲/۵۰

تصانیف سید ابوالاعلیٰ مودودی

کتاب	تفصیل	قسم اعلیٰ مع دیدہ زیب گردپوش	سستا ایڈیشن
تفہیم القرآن ۱	جلد اول سورۂ فاتحہ تا سورۂ انعام۔ اردو زبان میں قرآن مجید کے مطالب سمجھنے کا اس تفسیر سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہے	۲۱/۲۵	۱۶/۲۵
خطبات	پندرھواں ایڈیشن، اسلام، کلمۂ طیبہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد پر نہایت آسان اردو میں خطبات جن کی سطر سطر ایمان میں اضافہ اور عمل پر آمادہ کرتی ہے	۴/۲۵	۲/۷۵
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	صحیح معنوں میں فہم قرآن کی کنجی، یہ کتاب پڑھ کر قرآن مجید پڑھیے معرفتِ قرآن کے دروازے کھل جائیں گے	۲/۵۰	۱/۷۵
اسلام اور جدید معاشی نظریات	جدید معاشی نظریات کا نہایت سائنٹفک اور حکیمانہ تجزیہ اور ان کا اسلام سے تقابل،	۲/۲۵	ــــ
سود	(مکمل نظرثانی اور عظیم اضافوں کے ساتھ) سود کے مسئلہ پر دینی، عقلی اور اقتصادی نتائج کے لحاظ سے ایک بے مثل کتاب، اقتصادیات کے علماء اور طلباء کے لیے ایک بنیادی کتاب۔	۵/۵۰	۳/۲۵
حقوق الزوجین	(طبع ہفتم) اسلام میں میاں اور بیوی کے باہمی حقوق و فرائض پر ایک مبسوط اور مستند کتاب جس کی ملکی عدالتوں میں سند مانی جاتی ہے	۲/۵۰	[illegible]
تجدید و احیائے دین	(بعد نظرثانی و اضافہ ساتواں ایڈیشن)	۲/۵۰	[illegible]
رسالہ دینیات	اسلام کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کا بہترین ذریعہ اردو (بیسواں ایڈیشن)	۲/۵۰	[illegible]
	انگریزی (ساتواں ایڈیشن)	۴/۵۰	ــــ
دین کی باتیں	(از مولانا عبدالحی رامپوری) تعلیم بالغان کے لیے بالخصوص اور عام تعلیم یافتہ مردوں اور عورتوں کے لیے اسلامی تعلیمات کو جاننے کا آسان ترین ذریعہ	ــــ	/۰۰
موتیوں کا ہار	(حصہ اول تا چہارم) از افضل حسین ایم اے ایل ٹی۔ بچوں کے لیے سچے موتیوں کے ہار سے بھی زیادہ قیمتی تحفہ مکمل سیٹ	ــــ	/۵

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۱۱-ای، شاہ عالم مارکیٹ لاہور

تصانیف پروفیسر محمد ابو زہرہ

استاذ قانون اسلامی ، قاہرہ یونیورسٹی ، مصر

شائقین علم ۔ ناشران و تاجران کتب کیلئے ایک اہم اعلان

ہم انتہائی مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ پروفیسر محمد ابو زہرہ نے، جو کہ عالم اسلام کی ایک مایہ ناز علمی شخصیت ہیں اور اپنی بلند پایہ تحقیقی و علمی تصانیف کیلئے پوری دنیا میں معروف و مشہور ہیں ۔ اپنی حسب ذیل جملہ تصانیف کے اردو ترجمہ کے جملہ حقوق ہمیں عنایت فرمائے ہیں ۔

۱۔ ابو حنیفہ رح　　۲۔ مالک رح　　۳۔ شافعی رح
۴۔ ابن حنبل رح　　۵۔ امام زید رح　　۶۔ امام جعفر صادق رح
۷۔ ابن حزم رح　　۸۔ ابن تیمیہ رح
۹۔ الاحوال الشخصیة ۔ قسم الزواج (شخصی قانون)
۱۰۔ احکام الترکات و المواریث (ترکہ اور وراثت کا قانون)
۱۱۔ احکام الوصیة (وصیت کے احکام)　　۱۲۔ اصول الفقہ
۱۳۔ الجریمة و العقوبة فی الفقة الاسلامی (فقہ اسلامی میں جرم و سزا)
۱۴۔ المیراث عندالجعفریة (جعفریہ کے نزدیک وراثت کے احکام)
۱۵۔ محاضرات فی النصرانیہ (عیسائیت پر چند تقاریر)
۱۶۔ نظریة العرب فی الاسلام (اسلام کے متعلق عربوں کا نقطۂ نظر)

(بحوالہ مکتوب استاذ محمد ابو زہرہ مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۶۲ء)

ہم انشاء اللہ جلد استاذ موصوف کی مندرجہ بالا تصانیف کا اردو ترجمہ طبع کر کے پیش کریں گے لہذا اس سلسلہ میں جملہ متعلقہ حضرات ہم سے رجوع فرمائیں ۔

اخلاق حسین ۔ سکریٹری

اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ

۱۱۔ شاہ عالم مارکیٹ ۔ لاہور (پاکستان)